واقعہ اصحاب کہف (ایک جھلک)

سورۂ کہف آیت ۹ سے اصحاب کہف کی سرگذشت شروع ہوئی

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کیا تھا۔ اور ایک پہاڑ کے غار میں جاچھپے تھے۔ کئی برسوں تک یہ اس میں پوشیدہ رہے۔ آبادی سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا۔ زندگی کی کوئی صدا ، ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ پھر وہ اٹھائے گئے، یعنی ظاہر ہوئے اور یہ سارا معاملہ اس لئے ہوا کہ واضح ہو جائے، کہ  دونوں جماعتوں میں سے کون سی جماعت ایسی تھی جو اس وقت کے واقعات اور ان کے نتائج کا بہتر اندازہ کر سکتی تھی۔ دو جماعتوں سے مقصود اصحاب کہف اور ان کی قوم و ملک کے لوگ ہیں۔

یہ گویا اس تمام معاملے کا ماحصل ہے۔ اس کے بعد اس کی ضروری تفصیلات آتی ہیں۔ چنانچہ آیت ۱۳ میں فرمایا۔ نحن نقص عليك نباهم بالحق

(الف)

ایک گمراہ اور ظالم قوم سے چند حق پرست نوجوانوں کا کنارہ کشی کر لینا اور ایک پہاڑ کے غار میں جاکر پوشیدہ ہو جانا۔ ان کی قوم چاہتی تھی کہ  انہیں سنگسار کر دے یا  جبراً  اپنے دین میں واپس لے آئے۔ انہوں نے دنیا چھوڑ دی مگر حق سے منہ نہ موڑا۔

(ب)

جب وہ غار میں اٹھے تو اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ کتنے عرصہ تک یہاں رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی شہر میں کھانا لانے کیلئے بھیجا۔ اور کوشش کی کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ لیکن حکمت الٰہی کا فیصلہ دوسرا تھا۔ خبر ہو گئی  اور یہ معاملہ لوگوں کیلئے تذکیر و عبرت کا موجب ہوا۔

(ج)

جس قوم کے ظلم سے عاجز ہو کر انہوں نے غار میں پناہ لی تھی وہی ان کی اس درجہ معتقد ہوئی کہ ان کے مرقد پر ایک ہیکل تعمیر کیا گیا۔

اس واقعہ کی تفصیلات لوگوں کو معلوم نہیں۔ طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ بعض کہتے ہیں وہ تین آدمی تھے۔ بعض کہتے ہیں پانچ تھے۔ بعض کہتے ہیں سات تھے۔ مگر یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔ حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم ہے اور غور کرنے کی بات یہ نہیں ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی؟ دیکھنا چاہیے کہ ان کی حق پرستی کا کیا حال تھا؟

مسیحی مذہب کے ابتدائی قرنوں میں متعدد واقعات ایسے گزرے ہیں کہ راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے مخالفوں کے ظلم و وحشت سے تنگ آکر پہاڑوں کے غاروں میں پناہ لے لی۔اور آبادیوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہیں وفات پاگئے اور ایک عرصہ کے بعد ان کی نعشیں بر آمد ہوئیں۔ چنانچہ ایک واقعہ خود روم کے اطراف میں گذرا تھا۔ ایک انطاکیہ کی طرف منسوب ہے۔ ایک افس میں بیان کیا جا تا ہے ۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہو تا ہے کہ اس سورۃ میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ کہاں پیش آیا تھا؟ قرآن نے کہف کے ساتھ  الر قیم  کا لفظ بھی بولا ہے اور بعض آئمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کانام ہے۔ لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا۔ اس لئے اکثر مفسر اس طرف چلے گئے کہ یہاں  ر قیم  کے معنی کتابت کے ہیں۔ یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگادیا گیا تھا۔ اس لئے کتبہ والے مشہور ہو گئے۔

الرقيم

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم  ہو جا تا کہ  الر قیم  وہی لفظ ہے ، جسے تورات میں  "راقیم"    کہا گیا ہے، اور یہ في الحقیقت ایک شہر کا نام تھا۔ جو آگے چل کر    "پیٹرا " کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اور عرب اسے   "بطرا" کہنے لگے۔ عالمگیر جنگ کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلےہیں،  ان میں ایک   پیٹرا بھی ہے۔ اور اس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا مید ان مہیا کر دیا ہے۔ جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں۔ اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی  ہے۔ یہ علاقہ نبطی قبائل کا علاقہ تھا۔ اور اس کی ایک پہاڑی سطح پر  راقیم  نامی شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا،  تو یہاں کے شہروں کی طرح راقیم نے بھی ایک رومی نو آبادی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ ہے جب پیڑا کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیڑوں کی شہرت دور دور تک پہنچی۔640 عیسوی  میں جب  مسلمانوں  نے یہ علاقہ فتح کیا تو راقیم کا نام بہت کم زبانوں پر رہا۔  یہ رومیوں کا پیٹرا ، اور عربوں کا بطر ا تھا۔

جنگ کے بعد سے اس علاقہ کی ازسر نواثری پیمائش کی جارہی ہے اور نئی نئی باتیں روشنی میں آرہی ہیں۔ ازاں جملہ اس علاقہ کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں۔ اور نہایت وسیع ہیں۔ نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ  سکتی۔ ایک غار ایسا  بھی ملا ہے،کہ جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاںشناخت کی گئی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہو گا ۔ جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا۔ اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام ”ار قیم“  بتلا دیا ہے۔ اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں غیر ضروری  تکلفات کیے جائیں۔ بغیر کسی بنیاد کے اسے " کتبہ “ پر محمول کیا جائے۔ علاوہ  بر  ایں  دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو تا ہے کہ اس واقعہ کی عرب میں شہرت تھی۔ لوگ اس بارے میں بحثیں  کیا کرتے تھے۔اوراسے ایک نہایت ہی عجیب وغریب بات تصور کرتے تھے۔اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے وسائل ِمعلومات محدود تھے۔ بہت کم امکان ہے کہ دُور  درازکی باتیں ان کے علم میں آتی ہوں۔ پس یہ  ضروری ہے کہ یہ  قرب وجوار ہی کی کوئی بات ہو اور ان لوگوں کی زبانی سنی جاسکے،  جن سے ہمیشہ عربوں کا ملنا جلنا رہتا ہو۔ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے ؟اگر اسے ”پیٹرا‘‘  کا  واقعہ قرار دیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے ۔ اول تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا۔ یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر واقع تھا ۔  ثانیاً  نبطیوں کی وہاں آبادی تھی۔ اور نبطیوں کے تجارتی قافلے برا بر حجاز میں آتے رہتے تھے۔ یقینا ً ، نبطیوں میں اس واقعہ کی شہرت ہو گی اور انہی سے عربوں نے سنا ہو گا۔ خود قریش مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے۔اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی۔ جو رومیوں نے ساحلِ خلیج سے لے کر ساحل  مار  مورا   تک تعمیر کر دی تھی، پیٹر ا  اسی شاہراہ پر واقع تھا۔ بلکہ اس نواح کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی۔ اس لئے اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے، کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آ گیا ہو۔ اس سلسلہ میں چند باتیں اور تشریح طلب ہیں۔

جنگ کے بعد اس شاہرہ کا سراغ لگایا گیا تو یہ  پوری طرح نمایاں ہو گئی۔ اب یہ اپنے اصلی خط پر دوبارہ تعمیر کی جارہی ہے۔ اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہو چکی ہے۔ آج کل جہاں عقبہ ہے،  وہاں پہلے ترسیس آباد تھا۔ جہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے۔ اور بحیرہ   احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا۔

جاری ہے

اصل واقعہ

(الف) آیت 9

ام  حسبت  ان   اصحٰب  الكهف  و الرقيم  كانوا   من    اٰيتنا عجبا

کا  اسلوب ِخطاب صاف کہہ رہا ہے کہ کچھ لوگ "اصحاب الکہف والرقیم"  کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا معاملہ قدرت الٰہی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں نے پیغمبر اسلام سے ان کا ذکر کیا ہے اور اب وحِی الٰہی اس معاملہ کی حقیقت واضح کر رہی ہے ۔ چنانچہ پہلے مجملاً اس کا خلاصہ اور نتیجہ بتلا دیا کہ جو کچھ پیش آیا تھا وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو کچھ عبرت و تذکیر کی بات ہے وہ یہ ہے۔ پھر۔ آیت (۱۳) میں فرمایا۔

"نحن نقص عليك نباهم بالحق"

 اب ہم تجھے ان کی سچی خبر سنا دیتے ہیں یعنی واقعہ کی چند ضروری تفصیلات بیان کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ اس کے بعد تفصیلات بیان کی ہیں۔

یہ مجمل خلاصہ جو آیت (۱۰) سے (۱۲) تک بیان کیا ہے۔ تمام سرگذشت کا ماحصل ہے۔ اس کی روشنی میں بقیہ تفصیلات پڑھنی چاہئیں ۔

فرمایا۔

چند نوجوان تھے جنہوں نے سچائی کی راہ میں دنیا اور دنیا کی راحتوں سے منہ موڑا اور ایک غار میں پناہ گزین ہو گئے۔ ان کے پیچھے ظلم وستم کی قوتیں تھیں۔ سامنے غار کی تاریکی ،وحشت ، تاہم وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ "خدایا تیری ہی رحمت کا آسرا ہے اور تیری ہی چارہ سازی کا بھروسہ " ۔ چنانچہ کئی سال تک وہ وہیں رہے اور اس طرح رہے کہ دنیا کی صداؤں کی طرف سے ان کے کان بالکل بند تھے۔ پھر ہم نے انہیں اٹھا کھڑا کیا تاکہ واضح ہو جائے۔ ان دونوں جماعتوں میں سے کون گروہ تھا جس نے اس عرصہ میں نتائج عملی کا بہتر اندازہ کیا ہے؟ یعنی صورت حال نے دو جماعتیں پیدا کر دی تھیں۔ ایک اصحاب کہف تھے، ایک ان کے مخالف۔ ایک نے حق کی پیروی کی ،دوسرے نے ظلم و تشدد پر کمر باندھی۔ یہ چند برسوں کی مدت دونوں جماعتوں پر گزری تھی۔ اس پر بھی جو غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی اور اس پر بھی جس نے غار میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ اب دیکھنا یہ تھا  کہ دونوں میں سے کس نے کیا کمایا ہے ؟ اور کس نے کیا  کھویا ہے ؟ کون ان دونوں میں وقت کا بہتر اندازہ  شناس تھا؟

چنانچہ آگے چل کر جو تفصیلات آتی ہیں ۔ ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظالم جماعت کے ظلم کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ اور بالآخر وہی راہ فتح مند ہونے والی تھی جو اصحاب کہف نے اختیار کی تھی۔ کیوں کہ بالآخر مسیحی دعوت تمام ملک میں پھیل گئی۔ اور جب کچھ عرصہ کے بعد وہ غار سے نکلے اور ایک آدمی کو آبادی میں بھیجا تواب مسیحی ہونا کوئی نا قابلِ معافی جرم نہیں تھا، عزت وسر براہی کی سب سے بڑی عظمت تھی۔ صاف معلوم ہو تا ہے  کہ یہ ان پرستارانِ حق کی استقامت ہی تھی، جس نے دعوتِ حق کو فتح مند کیا۔ اگر وہ مظالم سے تنگ آکر اتباع حق سے دست بردار ہو جاتے تو یقینا یہ انقلاب ظہور میں نہیں آتا۔ (ب) اس کے بعد واقعہ کی بعض تفصیلات واضح کر دی گئی  ہیں۔ جو لوگ خدا پرستی کی راہ اختیار کرتے تھے۔ ان کی مخالفت میں تمام باشندے کمر بستہ ہو جاتے ۔ اور اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آتے  تو سنگسار کر دیے جاتے۔ یہ  حالت دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ آبادی سے منہ موڑ یں۔ اور کسی غار میں معتکف ہو کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائیں۔ چنانچہ ایک غار میں  اعتکاف اختیار کیا۔

غار کی نوعیت:

ان کا ایک وفادار کتا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ غار میں چلا گیا۔ جس غار میں انہوں نے پناہ لی ،وہ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگر چہ اندر سے کشادہ ہے ،  اور دہانہ کھلا ہوا۔ لیکن سورج کی کرنیں اس میں راہ نہیں پاسکتیں۔ نہ  چڑھتے دن میں نہ ڈھلتے دن میں۔ جب سورج نکلتا ہے تو داہنی جانب رہتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے۔ یعنی غار اپنے طول میں شمال و جنوب رویہ واقع ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے۔ دوسری طرف منفذ۔

 روشنی اور ہوا دونوں طرف سے آتی ہے۔ لیکن دھوپ کسی طرف سے بھی راہ نہیں پاسکتی۔ اس صورت حال سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوئیں۔

جاری ہے

گزشتہ سے پیوستہ

ان کا ایک وفادار کتا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ غار میں چلا گیا۔ جس غار میں انہوں نے پناہ لی ،وہ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگر چہ اندر سے کشادہ ہے ، اور دہانہ کھلا ہوا۔ لیکن سورج کی کرنیں اس میں راہ نہیں پاسکتیں۔ نہ  چڑھتے دن میں نہ ڈھلتے دن میں۔ جب سورج نکلتا ہے تو داہنی جانب رہتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے۔ یعنی غار اپنے طول میں شمال و جنوب رویہ واقع ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے۔ دوسری طرف منفذ۔

روشنی اور ہوا دونوں طرف سے آتی ہے۔ لیکن دھوپ کسی طرف سے بھی راہ نہیں پاسکتی۔ اس صورت حال سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک یہ کہ زندہ رہنے کیلیے وہ نہایت محفوظ اور موزوں مقام ہے۔ کیونکہ ہوا اور روشنی کی راہ موجود ہے۔ مگر دھوپ کی تپش نہیں پہنچ سکتی۔ پھر اندر سے کشادہ ہے، جگہ کی کمی نہیں ۔ دوسری یہ کہ باہر سے دیکھنے والوں کیلیے اندر کا منظر بہت ڈراؤنا ہو گیا ہے۔ کیونکہ روشنی کے منافذ موجود ہیں اس لیے بالکل اندھیرا نہیں رہتا۔ سورج کسی وقت سامنے آتا نہیں اس لیے بالکل اجالا بھی نہیں ہو تا۔ روشنی اور اندھیرے کی ملی جلی حالت رہتی ہے۔ اور جس غار کی اندرونی فضا ایسی ہو۔اسے باہر سے جھانک کر دیکھا جائے تو اندر کی ہر چیز ایک بھیانک منظر پیش کرے گی۔

یہ لوگ کچھ عرصہ تک غار میں رہے اس کے بعد نکلے تو انہیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ کتنے عرصہ تک اس میں رہے ہیں ۔ وہ سمجھتے تھے باشندوں کاوہی حال ہوگا جس حال میں انہیں چھوڑا تھا۔ لیکن اس عرصہ میں یہاں انقلاب ہو چکا تھا۔ اب غلبہ ان لوگوں کا تھا جو اصحاب کہف ہی کی طرح خدا پرستی کی راہ اختیار کر چکے تھے۔ جب ان کا ایک آدمی شہر میں پہنچا تو اسے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

اب وہی لوگ جنہوں نے انہیں سنگسار کرنا چاہا تھا۔ ان کے ایسے معتقد ہو گئے کہ ان کے غار نے زیارت گاہ عام کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور امراء شہر نے فیصلہ کیا کہ یہاں ایک ہیکل تعمیر کیا جائے۔

 اصحاب کہف نے یہ مدت کس حال میں بسر کی تھی؟ اس  بارے میں قرآن نے صرف اس قدر اشارہ کیا ہے کہ

 فضربناعلی آذانهم في الكهف سنين عدد۔

 ضرب علی آذان کے صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے۔ یعنی دنیا کی کوئی

صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی۔ لیکن مفسرین نے اسے نیند پر محمول کیا ہے۔

یعنی ان پر نیند طاری ہو گئی تھی۔اور چونکہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا۔ اس لیے اس حالت کو "ضرب علی الآذان"  سے تعبیر کیا گیا۔ اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کیلیے ضرب علی الآذان کی تعبیر ملتی نہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں یہ ایک طرح کا استعارہ ہے۔ گہری نیند کی حالت کو ضرب على الاذان  کی حالت سے تشبیہ دی گئی ۔

 اصل یہ ہے کہ اصحاب کہف کاجو قصہ عام طور پر مشہور ہو گیا تھا، وہ یہی تھا کہ غار میں برسوں تک سوئے رہے۔ اس لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ بعد کو بھی اس طرح کی رواتیں مشہور ہو گئیں۔ عرب میں قصہ کے اصلی راوی شام کے نبطی تھے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس قصہ کی اکثر تفصیلات تفسیر کے انہی راویوں پر جاکر منتہی ہوتی ہیں،  جو اہل کتاب کے قصوں کی روایت میں مشہور ہو چکے ہیں۔ مثلا ضحاک اور سیدی۔ بہر حال، اگر یہاں ضرب على الاذان سے مقصود نیند کی حالت ہو تو پھر مطلب  یہی قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے۔ اور"ثم بعثنا هم" کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے۔ اور وہ پھر بھی زندہ رہے، طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے۔ اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ پس اگر اصحاب کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستعد بات نہیں۔ البتہ قرآن حکیم کی تصریح اس بارے میں ظاہر اور قطعی نہیں ہے اس لیے احتیاط اس میں ہے که حزم ویقین کے ساتھ کچھ نہ کہا جائے۔

 وتحسبهم أيقاظاً  وهم رقود

میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت تھی۔ یا جو حالت اس غار کی ایک مدت تک رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انقلاب حال کے بعد اصحاب کہف نے غار کی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی۔ اس میں رہے۔ یہاں تک کہ انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد غار کی حالت ایسی ہو گئی کہ باہر سے کوئی دیکھے تو معلوم ہو کہ زندہ آدمی موجود ہیں۔ دہانے کے قریب ایک کتا دونوں ہاتھ آگے کیے بیٹھا ہے۔ حالا نکہ نہ تو آدمی زندہ  ہیں،  نہ کتا ہی زندہ ہے۔

جاری ہے

گزشتہ سے پیوستہ

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے۔ اور وہ پھر بھی زندہ رہے، طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے۔ اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ پس اگر اصحاب کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستعد بات نہیں۔ البتہ قرآن حکیم کی تصریح اس بارے میں ظاہر اور قطعی نہیں ہے اس لیے احتیاط اس میں ہے که حزم ویقین کے ساتھ کچھ نہ کہا جائے۔

 وتحسبهم أيقاظاً  وهم رقود

میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت تھی۔ یا جو حالت اس غار کی ایک مدت تک رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انقلاب حال کے بعد اصحاب کہف نے غار کی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی۔ اس میں رہے۔ یہاں تک کہ انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد غار کی حالت ایسی ہو گئی کہ باہر سے کوئی دیکھے تو معلوم ہو کہ زندہ آدمی موجود ہیں۔ دہانے کے قریب ایک کتا دونوں ہاتھ آگے کیے بیٹھا ہے۔ حالا نکہ نہ تو آدمی زندہ  ہیں،  نہ کتا ہی زندہ ہے۔

لیکن باہر سے دیکھنے والا انہیں زندہ اور جاگتا کیوں سمجھے ؟ اگر ان کی نعشیں پڑی ہیں تو نعشوں کو کوئی زندہ تصور نہیں کر سکتا۔ اگر  ر قود  سے مقصود سونے کی حالت ہے اور وہ لیٹے ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک لیٹا ہوا آدمی دیکھنے والے کو جاگتا ہی دکھائی دے۔

مفسرین نے یہ اشکال محسوس کیا۔ لیکن اس کا کوئی حل دریافت نہ کر سکے۔ بعضوں نے کہا وہ اس لئے جاگتے دکھائی دیتے ہیں کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ۔ لیکن اگر ایک بے حس و حرکت نعش پڑی دکھائی دے اور اس کی آنکھیں بھی ہوں تو دیکھنے والا اسے ہو شیار و بیدار کیوں سمجھنے لگا؟ یہی سمجھے گا کہ مر گیا ہے ۔ مگر آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ بعضوں نے کہا نقلبهم ذات اليمين وذات الشمال کی وجہ سے وہ بیدار دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ دائیں بائیں کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے دیکھنے والا خیال کرتا ہے ۔ بیدار ہیں۔ لیکن یہ تو جیہہ پہلے سے بھی زیادہ بے معنی ہے۔ اول تو کروٹ بدلنا بیداری کی دلیل نہیں۔ آدمی گہری سے گہری نیند میں ہو تا ہے۔ اور کروٹ بدلتا ہے۔ ثانیا  ًاگر کروٹ بدلتے ہوں گے تو کچھ وقفے کے بعد بدلتے ہوں گے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہر آن کروٹ بدلتے ہی رہتے ہوں۔ اور جب کبھی کوئی جھانک کر دیکھے انہیں کروٹ بدلتا ہی پائے۔ لطف یہ ہے کہ   نقلبهم ذات اليمين وذات الشمال  کی تفسیر میں یہی مفسر ہمیں بتلاتے ہیں کہ بعضوں کے نزدیک سال میں دودفعہ کروٹ بدلتی ہے ،بعضوں کے نزد یک ایک دفعہ بعض کہتے ہیں تین سال بعد ، بعض کہتے ہیں نو سال بعد ۔ علاوہ بریں قرآن نے یہ بات جس اسلوب و شکل میں بیان کی ہے۔

اس پران نکتہ وروں نے غور نہیں کیا۔

لو اطلعت عليهم لوليت منهم فرارا ولملئت منهم رغبا۔

 یعنی غار کے اندر کا منظر اس درجہ دہشت انگیز ہے کہ اگر تم جھانک کر دیکھو تو خوف کے مارے کانپ اٹھو۔ اور الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہو۔ اس سے معلوم ہوا غار کے اندر اصحاب کہف کے اجسام نے ایسا منظر پیدا کر دیا ہے جو بے حد دہشت انگیز ہے اگر آدمی باہر سے دیکھے تو دیکھنے کے ساتھ ہی اس پر دہشت چھا جائے معاً  الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہو۔ اب اگر اندر کا منظر صرف اتنا ہی تھا کہ چند آدمی لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے اس درجہ دہشت انگیزی پیدا ہو سکے۔ علاوہ بریں جو آدمی باہر سے جھانکے گا وہ اتنا بار یک بین نہیں ہو سکتا کہ غار کی تاریکی میں لیے ہوئے آدمیوں کی آنکھیں بھی بہ اول نظر دیکھ لے۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ داہنے یا بائیں کروٹ پر لیٹے ہوں۔

در اصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ اور جب تک مفسرین کے پیدا کئے ہو ئے تخیل سے بالکل الگ ہو کر تحقیق نہ کی جا ئے ۔اصلیت کا سراغ نہیں مل سکتا۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو حالت اس آیت میں بیان کی گئی ہے ۔ وہ کس وقت کی ہے ؟ اس وقت کی ہے جب وہ نئے نئے غار میں جاکر مقیم ہوئے تھے؟ یا اس وقت کی جب انکشاف حال کے بعد دوبارہ مختلف ہو گئے؟ مفسرین نے خیال کیا ۔ اس کا تعلق پہلے وقت سے ہے۔ اور یہی بنیادی غلطی ہے ۔ جس نے سارا الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ دراصل اس کا تعلق بعد کے حالات سے ہے۔ یعنی جب وہ ہمیشہ کیلئے غار میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد وفات پاگئے۔ تو غار کے اندرونی منظر کی یہ نوعیت ہوگئی تھی تحسبهم أيقاظاً وهم رقود میں ایقاظ   سے مقصود ان کا زندہ ہونا ہے۔ اور رقود سے مردہ ہونا ۔ نہ کہ بیدار اور خواب۔ چنانچہ عربی میں زندگی اور موت کیلئے یہ تعبیر عام معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ بات سامنے لانی چاہیے کہ یہ واقع مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے۔ اور جنہیں پیش آیا تھا۔ وہ عیسائی تھے ۔ صرف اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہو جا تا ہے۔

مسیحی دعوت کے ابتدائی قرنوں ہی میں زہدوانزدا کی ایک خاص زندگی شروع ہو گئی تھی۔ جس نے آگے چل کر رہبانیت کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیات یہ تھی کہ لوگ ترک علایق کے بعد کسی پہاڑ میں یا کسی غیر آباد گوشہ میں مختلف ہو جاتے تھے۔

گزشتہ سے پیوستہ

مسیحی دعوت کے ابتدائی قرنوں ہی میں زہدوانزوا کی ایک خاص زندگی شروع ہو گئی تھی۔ جس نے آگے چل کر رہبانیت کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیات یہ تھی کہ لوگ ترک علایق کے بعد کسی پہاڑ میں یا کسی غیر آباد گوشہ میں مختلف ہو جاتے تھے

اور پھر ان پر استغراق عبادت کی ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ وضع ونشت کی جو حالت اختیار کر لیتے اس میں پڑے رہتے یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی۔ مثلاً اگر قیام کی حالت میں مشغول ہوئے تھے، تو برابر کھڑے ہی رہتے اور اسی حالت میں جان دے دیتے۔ اگر گھٹنے کے بل رکوع کی حالت  اختیار کی تھی تو یہی حالت آخر تک قائم رہتی۔ اگر سجدے میں سر رکھ دیا تھا تو پھر سجدے ہی میں پڑے رہتے۔ اور مرنے کے بعد بھی اسی وضع میں نظر آتے۔ زیادہ تر گھٹنے کے بل رکوع کی وضع اختیار کی جاتی تھی۔ کیوں کہ عیسائیوں میں تعبد و تضرع کے لئے یہی وضع رائج ہو گئی تھی۔۔ غذا کی طرف سے یہ لوگ بالکل بے پروا ہوتے تھے۔ اگر آبادی قریب ہوتی تو لوگ روٹی اور پانی پہنچادیا کرتے،  نہیں ہوتی تو یہ جستجو نہیں کرتے ۔ عبادت کا استغراق جستجو کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے ان  کی حالت ویسی ہی تھی۔ جیسی ہندوستان کے جوگیوں کی رہ چکی ہے۔ اور اب بھی گاہ گاہ نظر آجاتی ہے۔ جس طرح زندگی میں انہیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا، اسی طرح مرنے کے بعد بھی کوئی اس کی جرات نہ کر تا۔ مدتوں تک ان کی نعشیں اسی حالت میں باقی رہتیں جس حالت میں انہوں نے زندگی کے آخری لمحے بسر کئے۔

اگر موسم موافق ہوتا اور درندوں سے حفاظت ہوتی تو صدیوں تک ڈھانچے باقی رہتے اور فاصلہ سے دیکھنے والا انہیں زندہ انسان تصور کر تا۔ چنانچہ وٹیکان کے تہ خانوں میں بے شمار ڈھانچے آج تک محفوظ ہیں، جو اس طرح کے مقامات سے بر آمد ہوئے تھے، اور اپنی اصل وضع  اور ہیت پر باقی تھے۔

ابتدا میں اس غرض سے زیادہ تر پہاڑوں کی غاریں یا پرانی عمارتوں کے کھنڈراختیار کیے گئے تھے۔ لیکن آگے چل کر یہ طریقہ اس درجہ عام ہو گیا کہ خاص عمارتیں اس غرض سے تعمیر کی جانے لگیں۔ یہ عمارتیں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ ان میں آمدورفت کے لیے کوئی دروازہ نہیں ہو تا تھا کیوں کہ جو جاتا تھا، وہ پھر باہر نہیں نکلتا تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی رکھی جاتی تھی جو ہوا اور روشنی کا ذریعہ ہوتی اور اسی کے ذریعے لوگ غذا بھی پہنچادیتے۔

 بعد کو جب مناسٹک ازم  (رہبانیت) کے باقاعدہ ادارے قائم ہو گئے تو اس طرح کے انفرادی انزوا کی مثالیں کم ہوتی گئیں۔ تاہم تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ ازمنہ وسطی تک یہ طریقہ عام طور پر جاری تھا۔ اور یورپ کی کوئی آبادی ایسی نہ تھی جو اس طرح کی عمارتوں سے خالی ہو۔ ان   مقامات کو عام طور پر Logette کہتے تھے اور جب ایک راہب یا راہبہ کا ان میں انتقال ہو جاتا تو ان پر لاطینی لفظ کندہ کر دیا جا تا  TU-ORA

 یعنی اس کے لیے دعا کرو۔

تمام تاریخیں متفق ہیں کہ مسیحی رہبانیت سب سے پہلے مشرق میں شروع ہوئی۔اور اس کا بڑا مرکز فلسطین اور مصر تھا۔ پھر چوتھی صدی مسیحی میں یہ یورپ پہنچی۔ اور سینٹ بنی ڈکٹ Benedict نے سب سے پہلے اس کے قواعد وضوابط منضبط کئے۔ سینٹ بینی ڈکٹ نے بھی ایک پہاڑ کی غار ہی میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔

مسیحی رہبانیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی ابتدا ، اضطراری حالات سے ہوئی تھی۔ آگے چل کر اس نے ایک اختیاری عمل کی نوعیت پیدا کر لی۔ یعنی ابتداء میں لوگوں نے مخالفوں کے ظلم و تشدد سے مجبور ہو کر غاروں اور جنگلوں میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ اضطراری طریقہ زہد و تعبد کا ایک اختیاری اور مقبول طریقہ بن گیا۔ مزید تشریح اس مقام کی سورۃ حدید کی تشریحات میں ملے گی۔

بہر حال،  معلوم ہو تا ہے کہ اصحاب کہف کا معاملہ بھی تمام تراسی نوعیت کا تھا۔ ابتدا میں قوم کے ظلم نے انہیں مجبور کیا تھا کہ غار میں پناہ لیں۔ لیکن جب کچھ عرصہ تک وہاں مقیم رہے تو زہد و عبادت کا استغراق کچھ اس طرح ان پر چھا گیا کہ پھر دنیا کی طرف لوٹنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ اور گو ملک کی حالت بدل  چکی تھی، لیکن وہ بدستور غار ہی میں معتکف رہے۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

انتقال اس حال میں ہوا کہ جس شخص نے ذکر و عبادت کی جو وضع اختیار کر لی تھی، وہی وضع آخری لمحوں تک باقی رہی۔ ان کے وفادار کتے نے بھی آخر تک ان کا ساتھ دیا۔ وہ پاسبانی کے لیے دہانے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ جب اس کے مالک مر گئے تو اس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا۔

اب اس واقعہ کے بعد غار کے اندرونی منظر نے ایک عجیب دہشت انگیز نوعیت پیدا کر لی ۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے تو اسے راہبوں کا ایک پورا مجمع ذکر و تعبد میں مشغول دکھائی دے گا۔ کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے کوئی سجدے میں پڑا ہے کوئی ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔دہانے کے قریب ایک کتا ہے، وہ بھی بازو پھیلائے باہر کی طرف منہ کئے ہوئے ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپ نہ اٹھے۔ کیوں کہ اس نے یہ سمجھ کر جھانکا تھا کہ مر دوں کی قبر ہے۔ مگر منظر جو دکھائی دیا وہ زندہ انسانوں کا ہے۔

اب اس واقعہ کے بعد غار کے اندرونی منظر نے ایک عجیب دہشت انگیز نوعیت پیدا کر لی ۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے تو اسے راہبوں کا ایک پورا مجمع ذکر و تعبد میں مشغول دکھائی دے گا۔ کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے کوئی سجدے میں پڑا ہے کوئی ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔دہانے کے قریب ایک کتا ہے، وہ بھی بازو پھیلائے باہر کی طرف منہ کئے ہوئے ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپ نہ اٹھے۔ کیوں کہ اس نے یہ سمجھ کر جھانکا تھا کہ مر دوں کی قبر ہے۔ مگر منظر جو دکھائی دیا وہ زندہ انسانوں کا ہے۔

یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو  ہر بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے۔ گویا تمام قفلوں کو کھلنے کے لیے صرف ایک کنجی کا انتظار تھا  ۔

تحسبھم ایقاظاً  وھم رقود

کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کسی دور از کار توجیہہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ اس طرح کا منظر یہی خیال پیدا کرے گا کہ لوگ زندہ ہیں۔ حالانکہ زندہ نہیں

لواطلعت عليهم لوليت منهم فرارا ولملئت منهم رعبا

کی علت بھی سامنے آگئی اور وہ تمام بے معنی تو جیہیں غیر ضروری ہو گئیں، جن پر امام رازی مجبور ہوئے ہیں۔ اگر تم کسی قبر کے اندر جھانک کر دیکھو اور تمہیں مردہ نعش کی جگہ ایک آدمی نماز پڑھتا دکھائی دے تو تمہارا کیا حال ہو گا؟ یقیناً  مارے دہشت کے چیخ اٹھو گے۔ اس طرح

 " ونقلبهم ذات اليمين وذات الشمال "

 کی تفسیر میں بھی کسی تکلف کی احتیاج باقی نہیں رہی۔ غار شمال و جنوب رویہ واقع تھا،  اور ان دونوں جہتوں میں ہوا اور روشنی کے منافذ تھے۔ جیسا کہ آیت

وترى الشمس إذا طلعت

سے متبادر ہو تا ہے۔ پس بالمقابل منافذ ہونے کی وجہ سے ہوا برابراندر چلتی رہتی تھی۔اور ان کے ڈھانچے داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنی جانب اس طرح متحرک رہتے تھے جیسے ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسری طرف دیکھے ۔

اس تفسیر کے بعد اس سوال کاجواب بھی خود بخود مل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کیوں بیان کی کہ سورج کی کر نیں غار کے اندر نہیں پہنچتیں،  جیسا کہ سورۃ کہف کی آیت ۱۷ میں ہے اور کیوں اسے قدرت الہی کی ایک نشانی فرمایا کہ

 ذٰلك من آيات اللہ

معلوم ہو گیا کہ یہ در اصل اس بات کی تمہید تھی جو بعد میں  آیت ۱۸ میں بیان کی گئی ہے کہ

تحسبهم أيقاظا  وهم رقود

 یعنی چونکہ یہ بات بیان کرنی تھی کہ مرنے کے بعد ان کی نعشیں عرصہ تک باقی رہیں۔ حتی ٰکہ دیکھنے والوں کو زندہ انسانوں کا گمان ہو تا تھا۔ اس لئے پہلے اس کی علت واضح کر دی کہ جس غار میں معتکف ہوئے تھے۔ وہ اس طرح کی غار تھی کہ انسانی جسم زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اس میں قائم رہ سکتا تھا۔ کیونکہ سورج کی روشنی اس میں پہنچتی رہتی۔ لیکن سورج کی تپش کا اس میں گزر نہ تھا۔ جو چیز نعش کو جلد گلا سڑا دیتی ہے وہ سورج کی تپش ہے۔ اور جو چیز تازگی پیدا کرتی ہے وہ ہوا اور روشنی ہے۔ ہوا چلتی رہتی ،روشنی پہنچتی رہتی۔ مگر تپش سے پوری حفاظت تھی۔ "ذٰلك من آيات الله"

 ولبثوافي کهفهم ثلاث مائة سنين واذدادوا تسعا ۔  کا کیا مطلب ہے؟

کیا یہ خود قرآن کی تصریح ہے کہ وہ لوگ اتنی مدت تک غار میں پڑے رہے ؟ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بعد کیوں فرمایا کہ

 "قل الله أعلم بما لبثوا "

مفسرین کواس اشکال کو دور کرنے میں طرح طرح کے تکلفات کرنا پڑے۔ حالانکہ صاف مطلب وہی ہے جو حضرت عبداللہ ابن عباس  رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یعنی جس طرح پہلے ان کی تعداد کے بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال نقل کئے تھے ، اسی طرح یہاں مدتِ  بقا کے بارے میں لوگوں کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں کہ غار میں تین سو برس تک رہے۔ بعضوں نے اس پر نوسو برس اور بڑھادیے۔ تم کہد و، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ فی الحقیقت کتنی مدت گزر چکی تھی۔

۔ پس یہ قرآن کی تصریح نہیں ہے لوگوں کا قول ہے۔اور "سیقولون"

سے نقل اقوال کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اس سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے۔

(ط)امام قرطبی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ

" اولئك قوم فنوا و عدموا منذ مدة  طویلہ "

یعنی اصحاب کہف کی موت  پر ایک مدت گزر چکی ہے۔ ان کے اجسام فنا ہو گئے ۔ جس طرح ہر جسم فنا ہو جاتا ہے۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام کے غزوات میں بعض صحابہ کا گذر اصحاب کہف کی غار پر ہوا تھا  اور انہیں ان کی ہڈیاں ملی تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس سے اس کی بھی مزید تصدیق ہو گئی کہ یہ واقعہ پیٹرا میں پیش آیا تھا۔ مسیحی رہبانیت کے طریقہ کی نسبت مندرجہ  صدر بیان میں جو اشارات کیے گئے ہیں ، ان کی تفصیلات کے لیے حسب ذیل کتابیں دیکھنی چاہئیں۔

The Paradise or Garden of the Holy Fathers by E.A.W. Budge.

The Evolution of the Monastic ideal by H. B. Workman

Five centuries of Religion by George Gordon Coulton

The Medieval Mind by Henry Osborn Taylor

اس سلسلے کی پچھلی اقساط میں مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ کہف میں بیان کردہ اصحابِ کہف کا ذکر اور تفسیر بیان کی تھی ۔ اب  یہ تحریر آگے بڑھتے ہوئے   سورۃ کہف ہی میں مذکور  ایک اور اہم  شخصیت ، ذوالقرنین کے تذکرے تک پہنچ گئی ہے۔

سورۃ کہف میں تیسرا واقعہ جو بیان کیا گیا ہے وہ ذوالقرنین کا ہے۔ کیوں کہ لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تھا۔ تمام مفسرین متفق ہیں کہ سوال یہودیوں کی جانب سے تھا۔ اگر چہ غالبا ً یہ سوال مشرکینِ مکہ کی زبانی ہوا۔  کیوں کہ یہ سورت مکی ہے ۔  (یعنی مدینہ اور خیبر کے یہودیوں نے  ان سوالوں کو مشرکینِ مکہ کے حوالے کیا اور مشرکینِ مکہ نے ان سوالوں کے جواب بارگاہِ رسالت سے حاصل کر کے واپس یہودیوں تک پہنچا دیے۔)

قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے اس پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو حسب ذیل امور سامنے آ جاتے ہیں۔

اولاً ،  جس شخصیت کی نسبت پوچھا گیا ہے۔ وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا یعنی ذوالقرنین کالقب خود قرآن نے تجویز نہیں کیا ہے بلکہ یہ  پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے۔ کیوں کہ فرمایا"

"ويسئلونك عن ذي القرنين "

ثانیا ً ، اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اسے حکمرانی عطافرمائی تھی۔ اور ہر طرح کا ساز و سامان جو ایک حکمران کے لیے ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے فراہم ہو گیا تھا۔

 ثالثا ً، اس کی بڑی مہمیں تین تھیں۔ پہلے مغربی ممالک فتح کئے ، پھر مشرقی  ممالک ، اور پھر ایک ایسے مقام تک فتح کر تا ہوا چلا گیا جہاں پہاڑی درہ تھا اور اس کی دوسری طرف یا جوج اور ماجوج آ کر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

 رابعاً ، اس نے وہاں ایک محکم سد (دیوار )  تعمیر کر دی اور یاجوج و ماجوج کی راہ  بند ہوگئی۔

 خامساً ،  وہ ایک عادل حکمران تھا۔ جب وہ مغرب کی طرف فتح کر تا ہوا ،  دُور تک چلا گیا  ،تو اسے  ایک قوم ملی۔ جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم و تشدد کرے گا۔ لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جولوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے۔ ان کے لیے ویسا  ہی  اجر بھی ہو گا۔ البتہ ڈرنا انہیں چاہیے جو جرم  و  بد  عملی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ساد ساً ،  وہ خدا پرست اور راست باز انسان تھا اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔

 سابعاً، وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا۔ جب ایک قوم نے کہا کہ یاجوج اور ماجوج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں،  آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد  (دیوار) تعمیر کر دیں۔ ہم آپ کو خراج دیں گے۔ تو اس  نے کہا

" ما  مَکّنی فیہ ربِّی خیر "

 یعنی ، جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہی  میرے لئے بہتر ہے۔ میں تمہارے خراج کا طامع نہیں۔ یعنی میں خراج کی طمع سے کام نہیں  کروں گا بلکہ  اپنا فرض سمجھ کر یہ کام سر انجام دوں گا۔

تاریخ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف  و اعمال پائے جائیں وہی ذوالقرنین ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟

سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا وہ اس کے لقب کا تھا ،  عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی "قرن" کے صاف معنی "سینگ"  کے ہیں۔ پس ذوالقرنین کا مطلب ہوا  ، "دو سینگوں والا" ۔ لیکن چوں کہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملتا جس کا ایسا لقب رہاہو۔ اس لیے مجبوراً  "قرن"کے معنوں  میں طرح طرح کے تکلفات کرنا پڑے۔ پھر چوں کہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے۔ اس لئے متاخرین کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ چنانچہ امام رازی نے سکندر ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ اور اگر چہ حسب عادت وہ تمام اعتراضات نقل کردیے ہیں جو اس تفسیر پر وارد ہوتے ہیں۔ لیکن پھر حسب عادت ان کے بے محل جوابات پر  مطمئن بھی ہوگئے ہیں۔ حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کا ذوالقرنین ، سکندر مقدونی نہیں ہو  سکتا۔ نہ تو  اسکندر مقدونی  خدا پرست تھا، نہ عادل تھا،  نہ مفتوح قوموں کے لیے فیاض تھا اور نہ  اس نے کوئی سد (دیوار) ہی  بنائی ۔ بہر  حال  ، مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کا سراغ نہ لگا  سکے۔

جاری ہے۔

بنی اسرائیل کے نبی حضرت دانیال  علیہ السلام کا خواب

اگر ذوالقرنین کے مفہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا،  تو وہ صرف ایک دُور کا اشارہ تھا۔ جو حضرت دانیال  علیہ السلام کی کتاب میں ملتا ہے۔ یعنی ایک خواب انہوں نے بابل کی اسیری کے زمانہ میں دیکھا تھا۔

بابل کی اسیری کا زمانہ یہودیوں کے لیے نہایت مایوسی کا زمانہ تھا۔ ان کی قومیت پامال ہو چکی تھی۔  ان کا ہیکل منہدم ہو چکا تھا ۔ ان کے شہر اجاڑ تھے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اس ہلاکت کے بعد ان کی زندگی کا کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ میں حضرت دانیال کا ظہور ہوا۔ جو اپنے علم و حکمت کی وجہ سے  شاہِ  بابل کے دربار میں نہایت مقرب ہوگئے تھے۔ انہیں کی نسبت تورات میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ "بیلش فار" نامی  شاہِ  بابل کی سلطنت کے تیسرے برس انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا ۔ اور اس خواب میں آنے والے واقعات کی بشارت دی گئی تھی۔ چنانچہ کتابِ دانیالؑ میں ہے۔

"مَیں کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک مینڈھا کھڑا ہے۔ جس کے دو سینگ اونچے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا۔ اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا۔ میں نے دیکھا کہ پچھم  (مغرب)  اترا اور دکھن (جنوب) کی طرف وہ سینگ مارتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا۔ اور وہ بہت بڑا ہو گیا۔ میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا پچھم کی طرف سے ایک بکرا  آ کے تمام روئے زمین پر پھر گیا۔ اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا۔ وہ دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا اور اس پر غضب سے بھڑ کا ۔ اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے۔"

پھر اس کے بعد ہے کہ جبریل نمایاں ہوا اور اس نے اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ دو سینگوں والا مینڈھا میڈیا(شمال مشرقی ایران اور آزربائیجان کی ایک قدیم سلطنت ) اور فارس کی بادشاہت ہے۔ اور ایک سینگ والا بکرا یونان کی  بادشاہت۔  جو بڑاسینگ اس کی آنکھوں کے درمیان دکھائی دیا ہے۔ وہ اس کا پہلا بادشاہ ہو گا۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ مادہ (میڈیا) اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اور چونکہ یہ دونوں مملکتیں مل کر مستقبل میں ایک شہنشاہی بننے والی تھی۔ اس لئے شہنشاہِ  مادہ و فارس کو دو سینگوں اور مینڈھے کی شکل میں ظاہر کیا گیا۔ پھر اس مینڈھے کو جس نے شکست دی وہ یونان کے بکرے کا پہلا سینگ تھا۔ یعنی سکندر مقدونی تھا۔ جس نے فارس پر حملہ کیا اور کیانی شہنشاہی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس خواب میں بنی اسرائیل کے لیے بشارت یہ تھی کہ ان کی آزادی و خوش حالی کا نیا دور اسی دو سینگوں والی شہنشاہی کے ظہور سے وابستہ تھا۔ یعنی شہنشاہ فارس بابل پر حملہ کر کے فتح مند ہونے والا تھا۔ اور پھر اس کے ذریعہ بیت المقدس کی از سر نو تعمیر اور یہودی قومیت کی دوبارہ شیرازہ بندی ہونے والی تھی۔ چنانچہ برسوں کے بعد سائرس کا ظہور ہوا۔ اس نے میڈیا اور پارس کی مملکتیں ملا کر ایک عظیم الشان شہنشاہی قائم کر دی۔ اور پھر بابل پر پے در پے حملے کر کے اسے مسخر کر لیا۔

چونکہ اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اس لئے خیال ہو تا تھا کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لیے یہودیوں میں ذوالقرنین کا تصور پیدا ہو گیا ہو ۔ یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں۔ تاہم یہ محض ایک قیاس تھا اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔ لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے، جس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد منظر عام پر آئے،  اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا ۔ اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا۔ اور یہ سب محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا۔ بلکہ خود سائرس کا باشندگان فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔ اس انکشاف نے شک و تخمین کے تمام پردے اٹھادے۔ یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو استخر (Pasargadoe) کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا۔ اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ اوپر خطِ منحنی میں جو کتبہ کندہ تھا اس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے۔ مگر جس قدر باقی ہے وہ اس کے لیے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جائے۔اس سے معلوم ہو گیا کہ میڈیہ اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک مقبول اور عام تخیل تھا۔ اور یقیناً سائرس کو ذوالقرنین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تمثال میں پردوں کا ہونا اس کے ملکوتی صفات وفضائل کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ نہ صرف پارسیوں میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک  غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔

دو سینگوں کا تخیل ابتداء میں کیوں کر پیدا ہوا؟ کیا اس کی بنیاد حضرت دانیال علیہ السلام  کا خواب تھا؟  یا بطور خودسائرس نے یا باشندگانِ پارس نے یہ تخیل پیدا کیا؟

اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ لیکن اگر تورات کی روایات تسلیم کر  لی جائیں تو سائرس سے لے کر آر ٹاز رکیسز  (ار تخششت )اول تک تمام شہنشاہان ِ پارس،    بنی اسرائیل کے انبیا کرام علیھم السلام  سے عقیدت رکھتے تھے۔  اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس خواب سے ذوالقرنین کا لقب پیدا ہو گیا ہو ۔ بہر حال اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ سائرس کو ذوالقرنین سمجھا جاتا تھا۔ اور یقینا عرب کے یہودی بھی اسے اسی لقب سے پکارا کرتے تھے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد جب سائرس کے ان حالات پر نظر ڈالی جاتی ہے جو یونانی مورخوں کی زبانی ہم تک پہنچتے ہیں  تو معلوم ہو تا ہے کہ قرآن کے بیان کی ہو  بہو تصویر ہے۔ اور دونوں بیان اس درجہ باہم مطابقت رکھتے ہیں کہ ممکن نہیں کسی دوسری شخصیت کاوہم  و  گمان بھی کیا جا  سکے۔

یہ  یاد رکھنا چاہئے کہ شاہانِ فارس کے ناموں نے مختلف زبانوں میں مختلف صورتیں اختیار کر لی ہیں۔ اور اس کی وجہ سے مورخوں نے سخت غلطیاں کی ہیں۔ سائرس کا اصلی نام غائبا گور د، یا  گوروش تھا۔ جیسا کہ دارا کے کتبۂ بے ستون سے معلوم ہو تا ہے ۔ لیکن یونانی اسے سائرس  Cyrus کہنے لگے تھے ۔ اور یہودیوں نے اس کا تلفظ خورس کی شکل میں کیا۔ چنانچہ  یسیار،  ارمیا اور دانیال کے صحائف میں جا  بجا یہ نام آیا ہے۔ اور یہی گورش ہے۔ جس نے عربی میں خسرو کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ عرب مورخ اسے کیخسرو کے نام سے پکارتے ہیں۔

سائرس کالڑکا کیم بی سیز  Cambyses ہوا۔ یہ بھی یونانی تلفظ ہے۔ اس کا پارسی نام کیوچیہ تھا۔ جس نے یہودیوں اور عربوں کی زبان پر یہ کیقیاد کی شکل اختیار کی۔ شاہنامہ نے بھی اس کو اختیار کیا۔ کیوں کہ اس کی بنیاد عربی تراجم پر تھی۔ کیقیاد کے بعد دار یوش ہوا۔ جسے عام طور پر دارا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور تورات میں بھی یہی نام آیا ہے۔ دارا کے بعد آر ٹازر کیسز ہے۔ اسے تورات میں ارتخششت کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور عربوں میں اس کا نام  اردشیر مشہور ہو گیا۔

زمانہ حال کے محققین ِتاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین  زمانوں  میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا عہد  اسکندر کے حملے  سے پہلے   کا  ہے۔ دوسرا پارتھوی یا ملوک الطوائف کا۔ تیسر اساسانی سلاطین کا۔

 فارسی شہنشاہی کی عظمت کا اصلی عہد وہی ہے جو  اسکندر  کے  حملے  سے پہلے گزرا۔ اور جس کی تاریخ سائرس کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اس عہد کے حالات معلوم کرنے کے براہ راست ذرائع مفقود ہو  گئے  ہیں۔ جس قدر بھی حالات روشنی میں آئے ہیں ، وہ  تمام  تر  یونانی تحریروں سے  ماخوذ  ہیں۔ان میں زیادہ  اعتماد کے قابل تین مورخ ہیں۔

 ہیروڈوٹس Herodotus

ٹی سیاز Ctesias اور

زینوفن Xenophon

ایران کی فتح کے بعد جب عرب مورخین نے ایران کی تاریخ مرتب کرنا  چاہی تو انہیں جس قدر مواد ہاتھ آیا وہ تمام تر پارسیوں کی قومی روایات پر مشتمل تھا۔ ان روایات میں اسکندر کے حملے سے پہلے کازمانہ اسی طرح کے قومی افسانوں کی نوعیت رکھتا ہے، جس طرح ہندوستان میں  پرانوں کے افسانے یا مہا بھارت اور رامائن کے قصے ہیں۔ البتہ پچھلے دو عہدوں کی روائتیں تاریخی بنیادوں پر مبنی تھیں۔ جب دقیقی اور فردوسی نے شاہنامہ کو نظم کرنا چاہا تو انہیں عربی میں یہی مواد ملا  اور اسی کو انہوں نے نظم کا جامہ پہنادیا۔ پس یہ تمام ذخیر ہ قبل از سکندر عہد کے لیے کچھ سود مند نہیں ہے۔ اور سائرس کے حالات کے لیے ہمیں تمام تر یونانی مورخین کی شہادت ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام  سے پانچ سو ساٹھ برس پہلے ایران کی سرزمین دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جنوبی حصہ پارس کہلا تا تھا اور شمالی مغربی حصہ  میڈیا ۔  چونکہ ان کے ہمسایہ میں آشوری اور بابلی حکومتیں انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھیں۔اس لئے قدرتی طور پر یہ،  ان سے دبی ہوئی تھیں۔ دونوں مملکتوں میں مختلف قبائل کے امرا تھے۔جو اپنے اپنے حلقوں میں قبائلی حکومت رکھتے  تھے۔

612 قبل مسیح میں ، جب نینوا تباہ ہو گیااور آشوری فرماں روائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی  تو میڈیا کے باشندے آزاد ہو گئے۔اور بتدریج ایک قومی حکومت نشو  و  نما پانے لگی۔ اسی طرح پارس کے امراء قبائل میں سے بھی بعض امیروں کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ اور حکمران خاندان پیدا ہو گیا۔ تا ہم یہ دونوں مملکتیں وقت کی بے اثر حکومتیں تھیں اور بابل کی شہنشاہی جسے بخت  نصر کی قہارانہ فتح مندیوں نے تمام ایشیاء میں سر بلند کر دیا تھا۔ سب پر  چھائی ہوئی اور سب کو مقہور کئے ہوئے تھی۔

 دارا  کے کتبۂ  بے ستون میں اس  میڈیا کا نام "مادا" آیا ہے۔ اس لئے میڈیا  کو   اس کا نویانی تلفظ سمجھنا چاہیے۔ عرب مورخوں نے اسے" ماہات" سے تعبیر کیا ہے۔

جاری ہے۔

 ۵۵۹ قبل از مسیح میں ایک غیرمعمولی شخصیت غیر معمولی حالات کے اندر ابھری اور اچانک تمام دنیا کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ یہ پارس کے ایکے می نیز خاندان کا ایک نوجوان گورش تھا۔ جسے یونانیوں نے سائرس ،عبرانیوں نے خورس اور عربوں نے کیخسرو کے نام سے پکارا۔ اسے پہلے پارس کے تمام امیروں نے اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ پھر بغیر کسی خونریزی کے میڈیا کی مملکت پر فرمانروا ہو گیا۔

اور اس طرح دونوں مملکتوں نے مل کر ایران کی ایک عظیم الشان شہنشاہی کی صورت اختیار کر لی۔

(دارا نے بے ستون کے کتبہ میں اپنا سلسلہ ہنحانش نامی بادشاہ سے ملایا ہے ۔ یہی ہنحانش یونانی میں Achaemenes ہو گیا۔ ہیروڈوٹس کی روایت کے مطابق یہ سائرس کا پڑدادا تھا۔ یعنی ایکے منی نیز سے چائش پش  پیدا ہوا۔ اس سے کم بی سیز (کمبوچیہ ، یا کیقباد) اول اور کم بی سیز سے سائرس نے اپنے بڑے لڑکے کانام بھی کم بی سیز  رکھا تھا۔)

پھر اس  سائرس (گورش، خورس، کیخسرو)کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ فتوحات نہیں جو ظلم و قہر کی خون ریزیوں کے ذریعہ حاصل کی جاتی تھیں۔ بلکہ انسانیت و عدالت کی فتوحات جو تمام تر اس لئے تھیں کہ مظلوم قوموں کی داد رسی اور پامال   ملکوں    کی دستگیری ہو۔ چنانچہ ابھی بارہ سال کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بحر اسود سے لے کر بکڑیا(بلخ) تک ایشیاء کی تمام عظیم الشان مملکتیں اس کے آگے سر بہ سجود ہو چکی تھیں۔

دنیا کی تمام غیر معمولی شخصیتوں کی طرح سائرس کے ابتدائی حالات نے بھی ایک پراسرار افسانہ کی نوعیت اختیار کرلی ہے اور ہمیں اس کی جھلک شاہ نامہ کے افسانوں میں صاف صاف نظر آجاتی ہے۔ اس کا اٹھان زندگی کے عام اور معمولی حالات میں نہیں ہوا بلکہ ایسے عجیب حالات میں جو ہمیشہ پیش نہیں آتے اور جب کبھی پیش آتے ہیں تو یہ قدرت کی ایک غیر معمولی کرشمہ سنجی ہوتی ہے۔ قبل اس کے، کہ وہ پیدا ہو،اس کے نانا  اسٹیاگس Astyages نے اس کی موت کا سامان کر دیا تھا۔ لیکن اسے ایک حیرت انگیز طریقے سے بچالیا  گیا ۔ اور اس کی ابتدائی زندگی جنگوں اور پہاڑوں میں بسر ہوئی تھی  ۔ پھر ایک ایسا  وقت بھی  آ گیا   کہ اس کی غیر معمولی قابلیتیں اور اعلیٰ اخلاق و خصائل نے اسے ملک میں نمایاں کر  دیااور اس کی خاندانی شخصیت و شناخت  پہچان  لی گئی۔ اب اسے پورا موقع حاصل تھا کہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے۔ لیکن اسے ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا خیال نہیں گزرا۔ حتی کہ خود اسٹیا کس کی زندگی بھی اس کے ہاتھوں میں محفوظ رہی۔

تخت نشینی کے بعد سب سے پہلی جنگ جواسے پیش آئی وہ لیڈیا (Lydia) کے بادشاہ کروئسیس ( Croesus) سے تھی۔ لیکن تمام مورخین متفق ہیں کہ حملہ کر وئسیس کی طرف سے ہوا تھا۔ اور اس نے سائرس کو دفاع پر مجبور کر دیا تھا۔ لیڈیا سے مقصود ایشیائے کو چک (Asia Minor)  کا مغربی و شمالی حصہ ہے  جو یونانی تمدن کا ایشیائی مرکز بن گیا تھا۔ اور اس کی حکومت بھی اپنے تمام خصائص میں ایک یونانی حکومت تھی۔ جنگ میں سائرس فتح یاب ہوا لیکن رعایا کے ساتھ کسی طرح کی بد سلوکی نہیں کی گئی۔ انہیں محسوس بھی نہیں ہوا کہ ملک ایک انقلاب یا  جنگ کی حالت سے گزر رہا ہے۔ البتہ  کرونس کی نسبت یونانی روایت یہ ہے کہ اس کے عزم وہمت کی آزمائش کے لیے سائرس نے حکم دیا تھا کہ ایک  چتا تیار کی جائے اور اسے جلا دیا جائے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ مردانہ وار چتا پر بیٹھ گیا ہے  تو فوراً اس کی جان بخشی کر دی۔ اور اس نے بقیہ زندگی عزت احترام کے ساتھ بسر کی۔ اس جنگ کے بعد اسے مشرق کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ کیونکہ گیڈ روسیا (مکران) اور بکریا( بلخ) کے وحشی قبائل نے سرکشی کی تھی۔

 یہ مہم ۵۴۰ اور ۵۴۵ قبل مسیح کی درمیانی مدت میں واقع ہوئی ہو گی۔ تقریبا یہی زمانہ ہے جب باشندگان بابل نے اس سے درخواست کی  تھی  کہ بیل شازار (Belshazzar) کے مظالم سے انہیں نجات دلائے ۔  نینوا کی تباہی نے ایک نئی بابلی شہنشاہی کی بنیادیں استوار کر دی تھیں اور بنو کدنزار (بخت نصر) کی قاہرانہ فتوحات نے تمام مغربی ایشیاء کو مسخر کر لیا تھا۔ اس کا حملہ بیت المقدس تاریخ کا ایک انقلاب انگیز واقعہ ہے۔ وہ صرف بادشاہوں کو مسخر ہی نہیں کر تا تھا بلکہ قوموں کو غلام بنا تا اور ملکوں کو تباہ کر ڈالتا تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اس کی جنگ جو یا نہ قوتوں کی جانشیں ہوتی۔ اس کے بعد بابل کے مندروں کے پجاریوں نے (جو ملک میں سب سے زیادہ اثر و مقبولیت رکھتے تھے ) نابونیدس(Nabonidus) کو تخت نشین کیا تھا۔ لیکن اس نے حکمت کا تمام کاروبار بیل شازار کے ہاتھ چھوڑ دیا  جو ظلم و عیاشی کا مجسمہ تھا ۔ اس کے  بارے میں  حضرت دانیال علیہ السلام کے صحیفہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ بیت المقدس کے ہیکل کے مقدس پیالوں میں اس نے شراب پی تھی۔ اور ایک غیبی ہاتھ نے نمایاں ہو کر " منے منے تقیل و فرسین "کے الفاظ دیوار پر لکھ دیے تھے۔(صحیفۂ  دانیال ۱:۵)

(اس نوشتۂ دیوار کا مفہوم یہ ہے کہ تجھے کسوٹی پر پرکھا گیا ، اور تُو ناقص نکلا ، لہذا تجھ سے تخت لے کر تیرے دشمنوں کو دے دیا جائے گا۔)

جاری ہے۔

تمام مورخین متفق ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ مستحکم اور نا قابل تسخیر  کوئی شے نہ تھی۔ اس کی چار دیواری اتنی موٹی ،  تہ در تہ اور اونچی تھی کہ اسے مسخر کرنے کا وہم و  گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

بایں ہمہ سائرس نے باشندگان بابل کی فریاد پر لبیک کہا اور دو  آبہ کا تمام علاقہ فتح کر تاہوا شہر کے سامنے نمودار ہو گیا۔ چوں کہ خود باشندگان شہر بیل شازار کے مظالم سے تنگ آگئے تھے اور سائرس کے لیے چشم براہ تھے۔ اس لئے انہوں نے ہر طرح اس کا ساتھ دیا۔

خود بابلی حکومت کا ایک سابق گورنر گوب ریاس (Gobryas) اس کی فوج کے ساتھ تھا۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ اس شخص نے دریا سے نہریں کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری طرف ڈال دیا ۔ اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں داخل ہو گئی ۔ قبل اس کے کہ خود سائرس شہر میں پہنچے ،شہر فتح ہو چکا تھا۔

تورات کی شہادت یہ ہے کہ سائرس کا ظہور اور بابل کی فتح بنی  اسرائیل کے لیے زندگی و خوش حالی کا نیا پیام تھا اور یہ ٹھیک اسی طرح ظہور میں آئی جس طرح یسعیاہ نبیؑ نے ایک سو ساٹھ برس پہلے اور یرمیاہؑ نے ساٹھ برس پہلے وحی الہی سے مطلع ہو کر خبر دے دی تھی۔ چنانچہ سائرس نے دانیال نبؑی کی نہایت تو قیر کی۔ یہودیوں کو یروشلم میں بسنے کی اجازت دے دی۔ نیز اپنی تمام مملکت میں اعلان کیا کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہےکہ یروشلم میں اس کے لیے ایک ہیکل بناؤں (یعنی قدیم بر باد شده ہیکل سلیمانی  کو از سر نو تعمیر کروں) پس تمام لوگوں کو ہر طرح کاساز و سامان اس کے لیے مہیا کرنا  چاہیے ۔

اس نے سونے چاندی کے وہ تمام ظروف جو بنو کدنزار (بخت نصر)   ہیکل سے لوٹ کر لایا تھا۔ بابل کے خزانہ سے نکلوائے اور یہودیوں کے ایک امیر شیش بفر کے حوالے کر دیئے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد اس میں بدستور رکھ دیے جائیں۔ (عزرا۔ باب اول)

بابل کی فتح کے بعد سائرس کی عظمت تمام مغربی ایشیاء میں مسلم ہو گئی۔ ۵۳۹ ق م میں صرف اس کی تنہا شخصیت عظمت و حکمرانی کے عالمگیر تخت پر نمایاں نظر آتی ہے۔ بارہ برس پہلے وہ پارس کے پہاڑوں کا ایک گمنام انسان تھا ۔ لیکن اب ان تمام مملکتوں کا تنہا فرمانروا بن چکا تھا جو صدیوں تک قوموں کی ابتدائی عظمتوں اور فتح مندیوں کا مرکز رہ چکی تھیں۔ فتح بابل کے بعد وہ تقر یادس برس تک زندہ رہا اور ۵۳۹ قبل مسیح میں انتقال کر گیا۔ اب قبل اس کے کہ قرآن کے بیان کردہ حالات پر نظر ڈالی جائے ، اس بات پر غور کر لینا چاہیے کہ انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں اس شخصیت کے بارے میں کیا تھیں۔ اور یہودیوں کے اعتقاد میں کس طرح وہ حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی پیشین گوئی یسعیاہ نبیؑ  کی ہے جن کا ظہور سائرس کی فتحِ بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے بیت المقدس کی تباہی کی خبر دی ہےکہ بابل کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی ظہور میں آئے گی۔ اس کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر کی بشارت دی ہے اور اس سلسلہ میں خورس (سائرس) کے ظہور کا ذکر کیا ہے۔

"خداوند، یعنی  تیرا نجات دینے والا یوں فرماتا ہے کہ، یروشلم پھر آباد کیا جائے گا ۔ یہودا کے شہر بنائے جائیں گے۔ میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا۔ میں خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے۔ وہ میری ساری مرضی پوری کرےگا۔ خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا ،  تا کہ قوموں کو اس کے قابو میں کر دوں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا دوں۔اور دہرے دروازے اس کے لیے کھول دوں۔ ہاں میں تیرے آگے چلوں گا۔ میں ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا۔ میں پیتل کے دروازوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا میں گڑے ہوئے خزانے اور چھپے ہوئے مکانوں کے کنج تجھے عطا کر دوں گا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کروں گا تاکہ تو جان لے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں۔ جس نے اپنی برگزیدہ قوم اسرائیل کے لیے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا۔ "(یسعیاہ ۲۱ : ۲۴)

اس پیشین گوئی میں خدا کا یہ فرمان نقل کیا گیا ہے کہ خورس (سائرس) میرا چر واہا ہو گا۔ اور میں نے اسے اس لیے پکارا ہے کہ نبی اسرائیل کو بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے۔ نیز اسے خدا کا مسیح بھی کہا ہے۔ اسی طرح یرمیاہ نبؑی نے ساٹھ برس پہلے پیشین گوئی کی تھی۔

"قوموں کے درمیان منادی کر دو۔ اور اسے مت چھپاؤ۔ تم کہو کہ بابل  لے لیا گیا، بعل رسوا ہوا ، مردوک سراسیمہ کیا گیا۔ اس کے بت خَجِل ہوئے۔ اس کی مورتیں پریشان کی گئیں۔ کیونکہ شمال  سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہوئی آ رہی ہے۔ جو اس کی سرزمین اجاڑ دے گی۔ یہاں تک کہ اس میں کوئی نہیں رہے گا(۱:۵۰)

(بعل اور مردوک بابلی قوم کے بڑے دیوتا تھے، جن کی وہاں عبادت کی جاتی تھی۔

جاری ہے

یرمیاہ نبیؑ نے اس بات  کی بھی پیشین گوئی کر  دی تھی کہ ستر برس تک یہودی بابل میں قید رہیں گے۔ اور اس کے بعد بیت المقدس کی نئی تعمیر ہو گی۔

"خداوند فرماتا ہے کہ  جب بابل پر ستر برس گزر چلیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا۔ تب تم مجھے پکارو گے۔ اور میں جواب دوں گا۔ تم مجھے ڈھونڈو گے اور مجھے پالو گے۔ میں تمہاری اسیری ختم کر دوں گا۔ تمہیں تمہارے مکانوں میں واپس لے آؤں گا۔" (۱:۲۹)

اس پیشین گوئی میں خدا نے اپنی رحمت کی واپسی کو فتح بابل کے واقعہ سے وابستہ کر دیا ہے۔ گویا سائرس کا ظہور اس کی رحمت کا ظہور ہو گا۔ جو بنی اسرائیل پر لوٹ آئے گا۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب سائرس نے بابل فتح کیا تو دانیال نبیؑ نے  (جو شاہان بابل کے وزراء میں داخل ہوئے تھے) ،  اسے یسعیاہ نبیؑ کی پیشین گوئی دکھلائی کہ ایک سو ساٹھ برس پہلے اس کے ظہور کی خبر دے دی گئی تھی۔ یہ بات دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا نتیجہ وہ فرمان تھا جو اس نے ہیکل  سلیمانی کی از سرِ نو  تعمیر کے سلسلے میں  جاری کیا تھا۔

زمانہ حال کے بعد  نقاد ایسے ہیں کہ جو  ان پیشین گوئیوں کی اصلیت پر مطمئن نہیں ہیں اور وہ کہتے ہیں،کہ ہو سکتا ہے کہ یہ پیشن گوئیاں واقعات کے ظہور کے بعد بڑھادی گئی ہوں۔ خصوصاً   حضرت یسعیاہ نبی  علیہ السلام  کی پیشین گوئی جس میں صریح و واضح  خورس (سائرس) کانام موجود ہے۔ لیکن وہ اس اشتباہ کی تائید میں عقلی استغراب کے سوا اور کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ اور محض عقلی استغراب،  ان صحائف کے خلاف حجت نہیں ہو سکتا، جن کی  نسبت یہ یقین کیا گیا ہے کہ الہام سے لکھے گئے تھے۔

علاوہ بر ایں،  تورات کے آخری صحائف جو فتح بیت المقدس کے اثناء میں یا اسیری بابل کے زمانہ میں لکھے گئے ہیں، سب کے سب  تاریخی حیثیت سے محفوظ تسلیم کر لئے گئے ہیں کیوں کہ وہ اس وقت سے برابر یہودیوں میں متداول رہے ۔ اور کوئی حادثہ ایسا رونما نہیں ہوا کہ اگلے نسخے نابود ہوگئے ہوں۔  ہاں البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ یسعیاہ نبی علیہ السلام کی پیشین گوئی میں بھی دانیال نبی علیہ السلام  کے خواب کی طرح خورس کا نام نہ بتلایا گیا ہو۔ صرف قوم وملک کا ذکر ہوا اور بعد کو یہ نام بڑھادیا گیا ہو۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد برابر یہی  رہا کہ سائرس کا ظہور نبیوں کی پیشین گوئی کے  عین مطابق ہوا تھا۔ اور وہ خدا   کی ایک پسندیدہ ہستی تھی۔ جواس لئے پیدا کی گئی تھی کہ مظلوموں کی داد رسی ہو اور بابلیوں کے ظلم  و شرارت سے قوموں کو نجات ملے۔

بنی اسرائیل کی روایات یعنی اسرائیلیات  ، عہد نامہ عتیق  و عہد نامہ جدید میں  موجود شواہد ، تاریخ کی گواہی اور خود محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے دیے گئے دلائل ، یہ سب تو ہمارے پاس یہاں جمع ہو گئے۔

اب  اگر ہم غور کرتے ہیں تو واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے  کہ قرآن کی تصریحات نے جو جامہ تیار کیا ہے وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک صرف سائرس (یعنی خورس)  ہی کے جسم پر راست آتا ہے ۔

سب سے پہلے اس بات پر غور  فرمائیے کہ ذوالقرنین کی نسبت یہ  سوال نبیِ آخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہِ وسلم سے   بالا تفاق یہودیوں کی جانب سے  پوچھا گیا  تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی بادشاہ کی شخصیت یہودیوں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جاسکتی تھی تو وہ صرف سائرس ہی کی تھی۔

نبیوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق، دانیال نبیؑ کے خواب کا ظہور، رحمتِ الہیہ  کی واپسی کی بشارت، نبی اسرائیل کا نجات دہندہ، خدا کا  ایک فرستادہ ، چرواہا اور مسیح، یروشلم کی تعمیر ثانی کا وسیلہ ، پس اس سے زیادہ قدرتی  بات اور کیا ہو  سکتی ہے کہ اس ہی  کی نسبت ان کا سوال ہو ؟

(جاری ہے۔)

علامہ آلوسی  کی تفسیر میں بیان کردی  ایک روایت میں بھی( جو قرطبی وغیرہ نے نقل کی ہے) اس طرف صریح اشارہ ملتا ہے ۔

 قال قالت اليهود:" أخبرنا  عن نبیِ  لم يذكر الله في التورات الافي مكان واحد" قال:"ومن ؟ " قالوا  "ذوالقرنین ۔"

یعنی یہودیوں نے آنحضرت سے کہا: ۔"  اس کی نسبت ہمیں خبر دی جیے،  جس کا تذکرہ  تورات میں  صرف ایک بار اللہ تعالیٰ نے فرمایا  ہے ۔"  آپ ﷺ  نے فرمایا ، "وہ  کون ؟ "انہوں نے کہا: " ذوالقرنین۔"

 چوں کہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا اشارہ صرف دانیال نبیؑ کے خواب ہی میں آیا ہے۔اس لئے یہودیوں کا یہ بیان ٹھیک اسی طرف اشارہ تھا۔

علاوہ  بر  ایں ،  سائرس کے تمثال کے انکشاف نے قطعی طور پر یہ بات آشکار کر دی ہے کہ اس کے سر پر دو سینگوں کا تاج رکھا گیا تھا اور یہ فارس اور مادہ  (میڈیا )کی مملکتوں کے اجتماع و اتحاد کی علامت تھی۔

اس کے بعد قرآن کی تصریحات سامنے لائی جائیں  تو  سب سے پہلا وصف جو اس کا بیان کیا  گیا ہے  ، وہ یہ ہے کہ

"انامكنا لہ  فی الأرض واٰتینا ہُ مِن كل شئي  سببا" (سورۃ کہف : آیۃ 84)

"ہم نے اسے زمین میں قدرت دی تھی۔ اور ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔"

قرآن جب کبھی انسان کی کسی کامرانی وخوشحالی کو براہ راست خدا کی طرف منسوب کر کے کہتا ہے ،جیسا کہ یہاں آیا ہے ،  تو اس سے مقصود عموماً  کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو عام حالات کے خلاف محض اس کے فضل وکرم سے ظہور میں آئی ہو۔ مثلا حضرت یوسفؑ  کی نسبت فرمایا:

" كذلك مكنا ليوسف في الارض "

(سورۃ یوسف: آیۃ  56)

"اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کو حکومت دے دی۔ "

"ہم نے دے دی "، کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسف کو ہر طرح کے ناموافق حالات میں محض فضل ِ  الٰہی سے ایک غیر معمولی بات حاصل ہو گئی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ عام حالات کے مطابق ظہور میں آئی ہو۔ پس ضروری ہے کہ ذوالقرنین کو بھی حکمرانی کا مقام ایسے ہی حالات میں ملا ہو جو بالکل غیر معمولی قسم کے ہوں۔ اور انہیں محض توفیقِ الٰہی کی کرشمہ سازی سمجھا جا سکے۔ کیوں کہ اس کے تمکن فی الارض کو براہ راست خدا کی طرف نسبت دی گئی  ہے۔

 لیکن اس اعتبار سے سائرس کی زندگی ٹھیک ٹھیک اس آیت کی تصویر ہے۔اس کی ابتدائی زندگی ایسے حالات میں بسر ہوئی جنہیں حیرت انگیز حوادث نے ایک افسانہ کی شکل دے دی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ پیدا ہو، خود اس کا نانا اس کی موت کا خواہش مند ہو گیا تھا۔ ایک وفادار آدمی  نے اس کی زندگی بچائی۔اور وہ شاہی خاندان سے بالکل الگ ہو کر ایک گمنام گڈریے کی طرح پہاڑوں میں زندگی بسر کر تا  رہا ۔ پھر اچانک نمایاں ہو  گیا   اور بغیر کسی جنگ و مقاتلہ کے میڈیا کا تخت اس کے لیے خالی ہو  گیا۔

 یقینا ًیہ صورت حال واقعات و حوادث کی عام رفتار نہیں ہے جو ہمیشہ پیش آتی ہو۔  یہ نوا در ہستی کی ایک غیر معمولی عجائب آفرینی ہے۔ اور صاف نظر آرہا ہے کہ قدرت کا مخفی ہاتھ کسی خاص مقصد سے ایک خاص ہستی تیار کر رہا ہے اور زمانہ کی عام رفتار تھم گئی ہے تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے۔

اس کے بعد اس کی تین بڑی مہموں کا ذکر آتا ہے۔ ایک مغرب الشمس کی طرف یعنی پچھم کی طرف،  ایک مطلع الشمس کی طرف یعنی پورب کی طرف  اور تیسری ایک ایسے مقام تک جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی۔ اور یا جوج اور ماجوج وہاں آ کر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔ اب دیکھیے کہ  یہ تمام تفصیلات کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس کی فتوحات پر منطبق ہوتی ہیں۔

یاد رہے کہ پچھم اور  پورب  کے لیے مغرب الشمس اور مطلع الشمس کی تعبیر  تورات میں بھی جا بجا آئی ہے۔ مثلا ذکر یا نبیؑ کی کتاب میں ہے۔

"رب الافواج فرماتا ہے میں اپنے لوگوں کو سورج نکلنے کے ملک اور اس کے ڈوبنے کے ملک سے چھڑالوں گا۔"( ۷:۸)

اوپر  ہم  پڑھ  چکے ہیں  کہ سائرس نے ابھی فارس اور میڈیا کا تاج سر پر رکھا ہی تھا کہ ایشیائے کو چک کے بادشاہ کروئسس  نے حملہ کر دیا ۔ ایشیائے کو چیک کی یہ بادشاہت جو لیڈیا کے نام سے مشہور ہوئی ،  سائرس سے  پچھلی صدی کے اندر ابھری تھی۔ اس کا دار الحکومت سارڈیس (Sardis) تھا۔ سائرس کی تخت نشینی سے پہلے میڈیا اور لیڈیا میں کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔

بالآخر کروئسس کے باپ نے سائرس کے نانا  ، استیاگس کے باپ سے صلح کر لی۔ اور باہمی اتحاد کے استحکام کے لیے باہمی ازدواج کارشتہ بھی قائم ہو گیا۔ لیکن کروئسس نے یہ تمام عہد و پیماں اور باہمی  رشتے بھلادیئے ۔ وہ سائرس کی کامرانی برداشت نہ کر  سکا کہ فارس اور میڈیا کی مملکتیں متحد ہو کر ایک عظیم مملکت کی حیثیت اختیار کر رہی ہیں۔ اس نے پہلے بابل مصراور اسپارٹا کی مملکتوں کواس کے خلاف ابھارا اور پھر اچانک حملہ کر کے سرحدی شہر پٹیریا (Pteria) پر قبضہ کر لیا۔

اب سائرس مجبور ہو گیا کہ بلا توقف وہ اس حملہ کا مقابلہ کرے ۔ وہ میڈیا کے دارالحکومت سے (جواب ہمدان کے نام سے پکارا جاتا ہے ) نکلا اور اس تیزی کے ساتھ بڑھا کہ صرف دو جنگوں کے بعد پٹیریا اور سارڈیس سمیت  لیڈیا کی تمام مملکت پر قابض ہو گیا۔

ہیروڈوٹس نے اس جنگ کی سرگزشت پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہے۔اور اس کی بعض تفصیلات نہایت دلچسپ اور اہم ہیں ،لیکن  یہ موضوع  ہمارا   نہیں۔ وہ کہتا ہے۔ سائرس کی فتح مندی ایسی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پٹیریا کے معرکوں کے بعد صر ف چودہ  دن کے اندر لیڈیا کا مستحکم دارالحکومت مسخر ہو گیا اور کرو ئسس ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے سائرس کے آگے سر نگوں کھڑاتھا۔

اب تمام ایشیائے کو چک،  بحر شام سے لے کر کر اسود تک اس کے زیر نگیں تھا۔ وہ برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل تک پہنچ گیا ۔ قدرتی طور پر اس کے قدم یہاں پہنچ کر اس طرح رک گئے جس طرح بارہ سو سال پہلے طارق کے قدم افریقہ کے شمالی ساحل پر رک جانے والے تھے۔ اس کے فتح مند قدموں کے لیے صحراؤں کی وسعتیں اور پہاڑوں کی بلندیاں رکاوٹ نہ ہو سکیں۔ اس نے فارس سے لے کر لیڈیا تک چودہ سو میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ لیکن سمندر کی موجوں پر چلنے کے لیے اس کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حد نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا اور سورج اس کی لہروں میں ڈوب رہا تھا۔ یہ لشکر کشی جواسے پیش آئی، صریحاً مغرب کی لشکر کشی تھی کیوں کہ وہ  ایران سے مغرب کی طرف چلا اور  لیڈیا کے مغربی کنارے تک پہنچ گیا۔ یہ اس کے لیے مغرب الشمس کی آخری حد تھی۔

ایشیائے کو چک کا مغربی ساحل نقشہ میں نکالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ تمام ساحل اس طرح کا واقعہ ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں اور سمرنا کے قریب اس طرح کے جزیرے نکل آئے ہیں جنہوں نے ساحل کو ایک جھیل یا حوض کی کی شکل دے دی ہے ۔ لیڈیا کا دار الحکومت سارڈین مغربی ساحل کے قریب تھا۔ اور اس کا محل موجود ہ سمرنا سے بہت فاصلہ پرنہ تھا۔ پس جب سائرس سارڈین کی تسخیر کے بعد آگے بڑھا ہو گا تو یقیناً بحرایجین کے اس ساحلی مقام پر پہنچا ہو گا جو سمرنا کے قرب وجوار میں واقع ہے۔ یہاں اس نے دیکھا ہوگا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے۔ ساحل کی کیچڑ سے پانی گدلا ہو رہا ہے۔ اور شام کے وقت اس میں سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے۔ اس صورت حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا۔

و جدها تغرب فی عين حمئۃ.(٨٢)

" اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے ۔"

 یہ ظاہر ہے  کہ سورج کسی مقام میں بھی ڈوبتا نہیں لیکن ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ایک سنہری تھالی آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوب رہی ہے۔

دوسری لشکر کشی مشرق کی طرف تھی۔ چنانچہ ہیروڈوٹس اور ٹی سیاز دونوں اس کی مشرقی لشکر کشی کاذکر کرتے ہیں۔ جولیڈیا کی فتح کے بعد اور بابل کی فتح سے پہلے پیش آئی تھی۔ اور دونوں نے تصریح کی ہے کہ " مشرق کے بعض وحشی اور صحر انشیں قبائل کی سرکشی اس کا باعث ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے اس ارشاد کی تصدیق ہے کہ

حتى إذا بلغ مطلع الشمس وجدها تطلع على قوم لم تجعل لهم من دونها سترا (۹۰)

"جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تو اسے ایسی قوم ملی جو سورج کے لیے کوئی آڑ نہیں رکھتی تھی۔"

یعنی یہ خانہ بدوش قبائل تھے۔ اب یہ  خانہ بدوش قبائل کون تھے ؟ان مورخین کی صراحت کے مطابق بکڑیا یعنی بلخ کے علاقہ کے قبائل تھے۔ نقشہ پر اگر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ بلخ  ٹھیک ٹھیک ایران کے لیے مشرق اقصی کا حکم رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انہوں نے راہ روک دی ہے۔ اس کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ گیڈروسیا کے وحشی قبیلوں نے اس کی مشرقی سرحد میں بدامنی پھیلائی تھی۔ اور ان کی گو شمالی کے لیے اسے نکلنا پڑا۔ گیڈ روسیا سے  مقصود وہی علاقہ ہے جو آج کل مکران کہلاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کی طرف ہمیں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ مکران سے نیچے اس کے قدم نہیں اترے ہوں گے۔ اور اگر اترے ہوں گے تو دریائے سندھ سے آگے نہیں بڑھے ہو ں گے کیوں کہ دارا کے زمانے میں بھی اس کی جنوب مشرقی سرحد دریائے سندھ ہی تک معلوم ہوتی ہے۔

(ٹی سیاز (Ctesias)ایک یونانی تھا جو 398 قبل مسیح سے لے کر 414   قبل مسیح  تک شہنشاہان پارس کا دربار طبیب رہا اور اس زمانہ کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی مشہور خ لکھی۔ بعد کے یونانی مورخوں نے اس کے بعض بیانات شک کی نگاہ سے دیکھے ہیں۔ اور اس لئے اسے استناد کا وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو ہیر ودوٹس  (المتولد ۸۴ ق م) کی تاریخ کو حاصل ہوا ہے ۔ مگر موجودہ زمانے کے محققین تاریخ کا ایسا خیال نہیں ہے۔)

تیسری لشکر کشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یاجوج ماجوج کے حملے ہوا کرتے تھے۔ یہ یقینا اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (کیسپیئن سی ) کو داہنی طرف چھوڑ تا ہوا کوہ قاف (Caucasus)  کے سلسلہ کوہ تک پہنچ گیا تھا۔ اور وہاں اسے ایک درہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے در میان تھا۔ اس راہ سے یاجوج ماجوج آ کر  اس طرف کے علاقے میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے۔ اور یہیں اس نے سد (دیوار  ) تعمیر کی۔

قرآن نے اس مہم کا حال ان لفظوں میں بیان کیا ہے ۔

حتیٰ  اذا بلغ بين السدين وجدمن دونهما قوما لا يكادون يفقهون قولا (۹۳)

"یہاں تک کہ وہ دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچ گیا۔ ان کے اس طرف اسے ایک قوم ملی جو کوئی بات بھی سمجھ نہیں سکتی تھی۔"

 پس صاف معلوم ہو تا ہے کہ" سدین "سے مقصو کاکیشیا کا پہاڑی درہ ہے کیوں کہ اس کے داہنی طرف بحر خزر ہے۔ جس نے شمال اور مشرق کی راہ روک دی ہے۔ بائیں جانب بحر اسود سے جو شمال مغرب کے لیے قدرتی روک ہے۔ درمیانی علاقے میں اس کا سر  بفلک  سلسلہ کوہ ایک قدرتی دیوار کا کام دے رہا ہے ۔ پس اگر شمالی قبائل کے حملوں کے لیے کوئی راہ باقی رہی تھی تو وہ صرف اس سلسلہ کوہ کا ایک عریض درہ  یاوسطی وادی تھی۔ اور یقینا وہیں سے یاجوج ماجوج  کو دوسری طرف پہنچنے کا موقعہ ملتا تھا۔ اس راہ کے بند ہو جانے کے بعد نہ صرف بحر خزر سے لے کر بحر اسود تک کا علاقہ محفوظ ہو گیا۔ بلکہ سمندروں اور پہاڑوں کی ایک ایسی دیوار قائم ہو گئی جس نے تمام مغربی ایشیا کو اپنی پاسبانی میں لے لیا ۔ اور شمال کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ اب ایران شام، عراق، عرب ایشیائے کوچک بلکہ مصر بھی شمال کی طرف سے بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔ نقشہ میں یہ مقام دیکھیں تو  تمام مغربی ایشیا نیچے ہے۔ اور شمال میں بحر خزر ہے۔ اس سے بائیں جانب شمال مغرب میں بحر اسود ہے۔ درمیان میں بحر خزر کے مغربی ساحل سے بحر اسود کے مشرقی ساحل تک کاکیشیا کا سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ ان سمندروں اور درمیان کے سلسلہ کوہ نے مل کر سینکڑوں میلوں تک ایک قدرتی روک پیدا کر دی ہے۔ اب اس روک میں اگر کوئی شگاف رہ گیا تھا۔ جہاں سے شمالی اقوام کے قدم اس رکاوٹ کوپھلانگ سکتے تھے تو صرف یہی دو پہاڑوں کے درمیان کی راہ تھی۔ ذوالقرنین نے اسے بھی بند کر دیا۔ اور اس طرح  شمال اور مغربی ایشیا کا یہ درمیانی پھاٹک پوری طرح مقفل ہو گیا۔

باقی رہا یہ سوال کہ وہاں جو قوم ذوالقرنین کو ملی تھی۔ اور جو بالکل نا سمجھ تھی۔ وہ کون سی قوم تھی؟ تو اس سلسلے میں دو قومیں نمایاں ہوتی ہیں۔ اور دونوں کا اس زمانہ میں وہاں قریب قریب آباد ہونا تاریخ کی روشنی میں آچکا ہے۔ پہلی قوم وہ ہے جو بحر خزر کے مشرقی ساحل پر آباد تھی۔ اسے یونانی مورخوں نے  کیسپین کے نام سے پکارا ہے۔ اور اسی کے نام سے بحر خزر کا نام کیسپین پڑ گیا۔ دوسری قوم وہ ہے جو اس مقام سے آگے بڑھ کر عین کاکیشیا کے دامن میں آباد تھی۔ یونانیوں نے اسے  کول شی کے  نام سے پکارا ہے۔ اور دارا کے کتبہ  میں اس کانام کوشیہ  آیا ہے ۔ ان ہی دو قوموں میں سے کسی نے یادونوں قوموں نے ذوالقرنین سے یاجوج ماجوج کی شکایت کی ہو گی۔اور چونکہ یہ غیر متمدن قومیں تھیں۔ اس لئے ان کی نسبت فرمایا کہ

لايكادون يفقهون قولا

اس کے بعد ذوالقرنین کاجو وصف سامنے آتا ہے وہ اس کی عدالت گستری اور خدمت انسانی کی فیاضانہ سرگرمی ہے اور یہ اوصاف سائرس کی تاریخی سیرت کی اس درجہ آشکارا حقیقتیں ہیں کہ مورخ کی نگاہ کسی دوسری طرف اٹھ ہی نہیں سکتی۔

قرآن سے معلوم ہو تا ہے کہ اسے مغرب میں جو قوم ملی تھی اس کی نسبت حکم الہی ہوا تھا۔

 "یاذاالقرنین !اما أن تعذب وإما أن تتخذ فيهم حسنا (۸۲) "

"یعنی یہ قوم اب تیرے بس میں ہے۔ جس طرح چاہے تو ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔ خواہ سزا دے خواہ انہیں اپنا دوست بنالے۔"

 یقینا یہ لیڈیا کی یونانی قوم تھی۔ اس کے بادشاہ کروئسس  نے تمام عہد و پیمان اور باہم رشتہ داریاں بھلا کر بلاوجہ سائرس پر حملہ کر دیا تھا۔ اور صرف خود ہی حملہ آور نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وقت کی تمام طاقت ور حکومتوں کو بھی اس کے خلاف ابھار کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ اب جب تائید الہی نے اپنا کر شمہ دکھایا اور لیڈ یا مسخر ہو گیا   تو حکم الہی ہوا ۔ یہ لوگ بالکل تیرے رحم پر ہیں۔ جس طرح تو چاہے ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ اپنے ظلم و شرارت کی وجہ سے ہر طرح سزا کے مستحق ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ تائید الہی نے تیرا ساتھ دیا۔  دشمنوں کو مسخر کر دیا ۔ اب وہ بالکل تیرے اختیار میں ہیں۔ لیکن تجھے بدلہ نہیں لینا چاہیے۔ وہی کرنا چاہیے جو نیکی اور فیاضی کا مقتضا ہے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے ایسا ہی  کیا۔ آیۃ نمبر 88 کے مطابق  اس نے اعلان کیا کہ میں پچھلے جرم کی بنا پر کسی کو سزا نہیں دینا چاہتا۔ میری جانب سے عام بخشش کا اعلان ہے۔ البتہ آئندہ جو کوئی برائی کرے گا بلا شبہ اسے سزادوں گا۔ پھر اسے مرنا ہے۔ اور آخرت کا عذاب سخت جھیلنا ہے۔ اور جو لوگ میرے احکام مانیں گے۔ اور نیک کردار ثابت ہوں گے تو ان کے لیے ویسا ہی بہتر اجر بھی ہو گا۔ اور وہ میرے احکام بھی بہت آسان پائیں گے۔ میں بندگان خدا پر سختی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ ہو بہو اس طرز عمل کی تصویر ہے جس کی تفصیل ہمیں یونانی تاریخوں کے صفحات میں ملتی ہے اور جسے زمانہ حال کے تمام محققین تاریخ نے ایک مسلمہ تاریخی حقیقت تسلیم کر لیا ہے۔

تمام یونانی مورخ بالا تفاق شہادت دیتے ہیں کہ سائرس نے فتح کے بعد باشندگان لیڈیا کے ساتھ جو سلوک کیا وہ صرف منصفانہ ہی نہ تھا ، بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ تھا۔ وہ فیاضانہ تھا۔ وہ اگر اپنے دشمن کے ساتھ سختی کر تا تو یہ انصاف ہو تا ۔ کیوں کہ نا انصافی  ان کی ہی تھی۔ لیکن وہ صرف منصف ہونے پر قانع نہیں ہوا۔ اس نے رحم و  بخشش کا شیوہ اختیار کیا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ سائرس نے اپنی فوج کو حکم دے دیا تھا کہ دشمن کی فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ جھکا دے۔ اسے ہر گز قتل نہ کیا جائے۔

کروئسس شاہ لیڈیا کی نسبت صریح حکم تھا کہ کسی حال میں بھی اسے گزند نہ پہنچائی جائے۔ اگر وہ مقابلہ کرے جب بھی اس پر تلوار نہیں اٹھانی چاہیے۔  اس حکم کی فوج نے اس دیانت داری کے ساتھ تعمیل کی کہ باشندگان کو جنگ کی مصیبت ذرا بھی محسوس نہ ہوئی۔ یہ گویا محض فرمان روا خاندان کا ایک شخصی انقلاب تھا کہ کروئسس کی جگہ سائرس نے لے لی۔ اس سے زیادہ کوئی انقلاب ملک و قوم کو محسوس ہی نہیں ہوا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سائرس کی فتح یونانی دیوتاؤں کی شکست تھی۔ کیوں کہ وہ اس مصیبت سے اپنے پرستار کر وئسس  کو نہ بچا سکے۔

 حالانکہ حملہ سے پہلے اس نے مندروں کے ہاتف اسے استصواب کر لیا تھا اور ڈیلفی کے ہاتف نے فتح کامرانی کی بشارت دی تھی۔ میں قدرتی طور پر واقعات کی یہ رفتار یونانیوں کے لیے خوش گوار نہ ہو  سکی۔ اور اس امر کی کوشش شروع ہو گئی کہ اس اصحاب کہف شکست میں بھی اخلاقی اور مذہبی فتح مندی کی شان پیدا کر دی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کروئسس کا معاملہ اچانک ایک پراسرار افسانہ کی شکل اختیار کر  لیتا ہے۔ اور یونانی دیو تا  اپنے سارے معجزوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہیروڈوٹس لیڈیا کے باشندوں کی یہ روایت نقل کرتا ہے کہ ڈیلفی کے ہاتف کا جواب غلط نہ تھا مگر کر وئسس نے جنگ کے جوش وطلب میں اس کا صحیح مطلب نہ سمجھا۔

ہاتف نے کہا تھا کہ اگر اس نے پارسیوں پر حملہ کیا تو وہ ایک بڑی مملکت تباہ کر دے گا۔ مگر اس نے خیال کیا بڑی مملکت سے مقصود پارسیوں کی مملکت ہے۔ نیز  وہ کہتا ہے پہلے سائرس نے حکم دیا تھا کہ لکڑیوں کی چتا تیار کی جائے اور اس پر کروئسس کو بٹھا کر آگ لگادی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آگ لگادی گئی۔ لیکن پھر جب کرو ئسس کی بعض باتیں سنیں تو بے حد متاثر ہوا۔ اور آگ بجھانے کا حکم دیا۔ لیکن اب آگ پوری طرح مشتعل ہو چکی تھی۔ ممکن نہ تھا کہ اسے فورا ً بجھایا جائے۔ یہ حال دیکھ کر کرو ئسس نے اپالو د یو تا کو پکارا۔ اور باوجود آسان بالکل صاف تھا اچانک بارش شروع ہو گئی اور اس طرح اس معجزے نے بر  وقت ظاہر ہو کر اس کی جان بچالی۔

لیکن خود ہیروڈوٹس اور زینوفن کی تصریحات سے جو حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ سائرس یا تو کروئسس کے عزم وصبر کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ یا یہ بات آشکارا کر دینا چاہتا تھا کہ یونانیوں کے خود ساختہ دیو تا اپنے عبادت گزاروں کی کچھ مدد نہیں کر سکتے۔اور جن دیوتاؤں کی مز عومہ  بشارت پر اعتماد کر کے جنگ کی گئی تھی ان میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنے پرستار کو زندہ جلنے کے عذاب سے بچالیں۔ یعنی مقصود یہ تھا کہ پہلے چتا پر بٹھایا جائے ، آگ بھی لگادی جائے۔ لیکن جب وہ خود اور تمام لوگ دیکھ لیں کہ دیوتاؤں کا کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا تو پھر اسے بخش دے۔ اور عزت و آرام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے جائے۔

دوسری علت زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ خود ہیروڈوٹس کی روایت میں اس کی جھلک موجود ہے اور یونانی افسانہ میں اپالو کی نمود بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔صاف معلوم ہوتا ہے کہ سائرس نے اپنے عمل سے جو حقیقت آشکارا کر دی تھی۔ یونانی افسانہ نے اس کا توڑ کرنے کے لیے اپالو کا معجزہ گھڑ لیا۔ قرآن نے ذوالقرنین کا یہ اعلان نقل کیا ہے کہ آئندہ جو ظلم کرے گا سزا پائے گا۔ جو حکم مانے گا اور نیک عمل ہوگا اسے انعام ملے گا۔ بعینہ زینوفن کی بھی ایسی ہی روایت ہے۔ قرآن میں ہے کہ

"وسنقول لہ من امرنا يسرا"

یعنی  اگر لوگوں نے نیک عملی اختیار کی تو دیکھ لیں گے کہ  میرے احکام و قوانین میں ان کے لیے سختی نہ ہو گی۔

تمام مورخ بالا تفاق شہادت دیتے ہیں کہ اس کے احکام و قوانین ایسے ہی تھے۔ وہ مفتوحہ ممالک کے باشندوں کے لیے سر تاسر شفقت ومرحمت تھا۔اس نے ان تمام بوجھل ٹیکسوں اور خراجوں سے رعایا کو نجات دے دی، جو اس عہد کے تمام حکمران وصول کیا کرتے تھے۔ اس نے جس قدر احکام و فرامین نافذ کئے وہ زیادہ سے زیادہ نرم اور زیادہ سے زیادہ ہلکے تھے۔

ہم نے Oracle کے لیے ہاتف کالفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اگر چہ اس کے لیے مترادف لفظ نہیں ہے۔ لیکن اصطلاح  کا مطلب بہتر طریقہ پر واضح کر تا ہے۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ مندروں میں ہاتف غیبی کی صدائیں سنی جاتی ہیں ۔اور خاص پجاریوں پر دیوتاؤں کاالہام ہو تا ہے۔ اس غرض سے خاص خاص مندروں کی شہرت تھی۔ لوگ چڑھاوے چڑھا کر اپنے سوالات پیش کرتے اور مجاور دیوتاؤں کی طرف سے جوابات سنادیتے۔

تمام مورخ بالا تفاق شہادت دیتے ہیں کہ اس کے احکام و قوانین ایسے ہی تھے۔ وہ مفتوحہ ممالک کے باشندوں کے لیے سر تاسر شفقت ومرحمت تھا۔اس نے ان تمام بوجھل ٹیکسوں اور خراجوں سے رعایا کو نجات دے دی، جو اس عہد کے تمام حکمران وصول کیا کرتے تھے۔ اس نے جس قدر احکام و فرامین نافذ کئے وہ زیادہ سے زیادہ نرم اور زیادہ سے زیادہ ہلکے تھے۔

یہ تو صرف اس کی مغربی فتح مندی کی سرگزشت تھی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اس کے اعمال کی عام رفتار کیسی رہی؟ اور قرآن کا بیان کردہ  وصف کہاں تک اس پر راست آتا ہے ۔۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم یونانی مورخوں کی شہادتوں پر متوجہ ہوں ، یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یونانی مورخ سائرس کے ہم قوم نہیں تھے، ہم وطن نہیں تھے اور ہم مذہب نہیں تھے۔اتنا ہی نہیں بلکہ دوست بھی نہیں تھے۔ سائرس نے لیڈیا کو شکست دی تھی۔ اور لیڈیا کی شکست یونانی قومیت یونانی تہذیب اور سب سے زیادہ  اہم یہ کہ خود  یونانی مذہب کی شکست تھی ۔ پھر سائرس کے جانشینوں نے براہ  راست یونانیوں کو زیر کیا تھا۔ اور ہمیشہ کے لیے دونوں قومیں ایک دوسرے کی حریف ہو گئی تھیں۔

ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ یونانی دماغ اپنے حریف کی مدحت سرائی کا شائق ہو گا۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مورخ اس کی غیر معمولی عظمتوں اور ملکوتی صفتوں کی مدحت سرائی میں رطب  اللسان ہے اور اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے محاسن نے ایک ایسے عالم گیر اعتراف و تاثر کی نوعیت اختیار کر لی تھی کہ دوست دشمن کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ سب کے دلوں میں ان کا اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔ سب کی زبانوں پر ان کی مدحت سرائی تھی۔ اور محاسن وہی ہیں جن کی حریفوں کو بھی شہادت دینی پڑے۔ یعنی :

وملیحۃُ  شھدت بہا  ضراتہا

 والفضل ما شھَدت بہ الاعداء

"اور خوبصورتی یہ ہے کہ سوکنیں بھی اس کی گواہی دیں اور فضیلت تو وہ ہے جس کی دشمن بھی شہادت دیں۔"

زینوفن لکھتا ہے:۔ "سائرس ایک نہایت دانش مند، سنجیدہ اور ساتھ ہی رحم دل فرمانرواتھا۔ اس کی شخصیت ہر طرح کے شاہی اوصاف اور حکیمانہ فضائل کا ایک اعلی ترین نمونہ تھی۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ اس کی شوکت و حشمت سے کہیں زیادہ اس کی مالی حوصلگی اور سیر چشمی تھی۔ اور اس کی فیاضی اور رحم دلی اپنی کوئی دوسری مثال نہیں رکھتی ۔ انسان کی خدمت اور ہمدردی اس کی شاہانہ طبیعت کاسب سے بڑا جو ہر تھا۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ مصیبت زدہ انسانوں کی خبر گیری کرے  اور مظلوموں کو ظلم  سے  نجات دلائے۔ درماندہ انسانوں کا ہاتھ پکڑے ،غم زدوں کے دکھ درد میں شریک ہو۔ پھر ان تمام عالی صفتوں کے ساتھ عاجزی اور انکساری اس کے حسن و کمال کا سب سے بڑا زیور تھی۔ اس نے ایک ایسے تخت پر بیٹھ کر ، جس کے آگے تمام قوموں کے سر جھک گئے تھے۔ اور ایک ایسے خزانے کامالک ہو کر جس میں تمام دنیا کی دولت سمٹ آئی تھی۔ کبھی گوارا نہیں کیا کہ فخر و غرور کو اپنے دماغ میں جگہ دے  ۔

ہیروڈوٹس لکھتا ہے:۔

"وہ ایک نہایت ہی مخیر پادشاہ تھا۔ اسے دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح دولت جمع کرنے کی حرص نہیں تھی۔ بلکہ وہ  جو د و  سخاوت کا  شوق رکھتا  تھا۔ وہ کہتا تھا  کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت اس بات میں ہے کہ نوع انسانی کی بھلائی کا موقع ملے  اورمظلوموں کی داد رسی ہو۔

ٹی سیاز لکھتا ہے :۔

اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کی جائے اور ماتحتوں کو اس سے فیض پہنچے۔ چنانچہ اس کی اس فیض رسانی نے اس کی تمام رعایا کے دل اس کے ہاتھوں میں دے دیئے تھے۔ وہ اس کے لیے خوشی خوشی اپنی گردنیں کٹوادیتے ۔"

سب سے زیادہ نمایاں بات جوان تمام مورخوں کے صفحات پر ملتی ہے وہ سائرس کی شخصیت کی غیر معمولی نمود ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ جس عہد میں پیدا ہوا  ، در حقیقت اس کی مخلوق نہیں تھا  بلکہ اپنے عہد سے بہت آگے کا فرد تھا ۔ اس کی  ایک بالا  تر شخصیت تھی۔ جسے قدرت نے اپنا کرشمہ دکھانے کے لیے نمودار کر  دیا تھا۔ دنیا کے کسی حکیم  ، کسی دانا نے اس کی تربیت نہیں کی۔وقت کے متمدن ملکوں میں سے کسی ملک میں اس کی پرورش نہیں ہوئی۔ وہ محض قدرت کا پروردہ تھا۔ اور قدرت ہی کے ہاتھوں نے اسے اٹھایا تھا۔ وہ فارس کے مشرقی پہاڑوں کا چرواہا تھا۔ تاہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہی  چرواہا جب دنیا کے سامنے آیا  تو  حکمرانی کا سب سے بڑا جلوہ ، دانش کا سب سے بڑا پیکر اور فضیلت کا سب سے بڑا نمونہ ، اسی سائرس  کی صورت میں  ان کے سامنے تھا۔

سائرس اور سکندر، ایک موازنہ:

 سکندر اعظم کو ارسطو کی تعلیم و تربیت نے تیار کیا تھا۔ اور بلا شبہ وہ دنیا کی تاریخ کا بہت بڑا فاتح نکلا۔ لیکن کیا انسانیت و اخلاق کا بھی کوئی گوشہ فتح کر سکا؟ سائرس کے لئے ہمیں کوئی ارسطو نہیں ملتا۔ اس نے انسانی حکمت کی درس گاہ کی جگہ قدرت کی درس گاہ میں پرورش پائی تھی۔  تاہم اس نے سکندر کی طرح صرف ملکوں ہی کو نہیں بلکہ انسانیت و فضائل کی مملکتوں کو بھی مسخر کر  لیا تھا۔ سکندر کی تمام فتوحات کی عمر اس سے زیادہ نہ تھی، جتنی خود اس کی عمر تھی۔ لیکن سائرس کی فتوحات نے جو اینٹیں چن دی تھیں وہ دو سو برس تک نہ ہِل سکیں۔ سکندر کے دم توڑتے ہی اس  کی مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ لیکن سائرس نے جب دنیا چھوڑی تو اس کی مملکت روز بروز وسیع و مستحکم ہونے والی تھی۔ اس کی فتوحات میں صرف مصر کا خانہ خالی رہ گیا تھا۔ اس کے فرزند ، کیقباد نے اسے بھی بھر دیا۔ اور پھر چند برسوں کے بعد دنیا کی عالم گیر سلطنت ظہور میں آگئی جو ایشیا،  افریقہ اور یورپ کے اٹھائیس ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس پر سائرس کا پڑپوتا ،  داریوش تن تنہا   حکمران تھا۔

سکندر کی فتوحات صرف جسم کی فتوحات تھیں، جنہیں قہر و طاقت نے سر کیا تھا۔ لیکن سائرس کی فتوحات روح ودل کی فتوحات تھیں۔ جنہیں انسانیت وفضیلت نے سر کیا تھا۔ پہلی سر اٹھاتی ہے لیکن دیر تک ٹِک نہیں سکتی۔ دوسری ٹِک جاتی ہے اور پھر ٹلتی نہیں۔ سائر س فتح بابل کے بعد دس برس تک زندہ رہا۔ اب اس کی حکومت عرب سے لے کر بحر اسود تک اور ایشیائے کو چک سے بلخ تک پھیلی ہوئی تھی اور ایشیاء کی تمام قومیں اس کے ماتحت آ چکی تھیں۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس تمام عرصہ میں بعاوت اور سرکشی کا ایک حادثہ بھی نہیں ہوا۔ کیوں کہ زینوفن کے لفظوں میں وہ صرف بادشاہ ہی نہ تھا۔ بلکہ انسانوں کا شفیق مربی اور قوموں کا رحم دل باپ تھا اور رعایا سخت گیر حکمرانوں سے بغاوت کر سکتی ہے ،لیکن اولاد اپنے شفیق باپ سے باغی نہیں ہو سکتی۔ موجودہ زمانے کے تمام مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت تھی۔ یہ ایسی خصوصیت تھی جو آگے چل کر رومن ایمپائر کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

سب متفقہ شہادت دیتے ہیں کہ اس عہد کے بادشاہوں کی سخت گیری، سخت دلی ، ظالمانہ طبیعت اور ہیبت  انگیز طریقہ تعذیب کی چھوٹی سے چھوٹی مثال بھی سائرس کے عہد میں نہیں ملتی۔

یاد رہے کہ یہ محض قدیم یونانی مورخوں کی روایات ہی نہیں بلکہ موجودہ زمانے کے تمام محققینِ  تاریخ کی تاریخی مسلمات ہیں۔ بالا تفاق یہ  بات تسلیم کر  لی گئی ہے کہ سائرس تاریخ قدیم کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔ جس میں بیک وقت فتوحات کی وسعت ، فرمانروائی کی عظمت اور اخلاق انسانیت کی فضیلت جمع ہو گئی تھی۔ اور وہ جس عہد میں ظاہر ہوا،  اس عہد میں اس کی شخصیت ہر اعتبار سے انسانیت کا ایک پیام اور قوموں کی نجات  تھی۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جی بی گرنڈی G.B.Grundy جو موجودہ زمانہ میں تاریخ قدیم کے ایک  مستند ماہر ہیں اور جن کی کتاب گریٹ پرشین وارGreat Persian War

نہایت مقبول ہو چکی ہے ۔ لکھتے ہیں:۔

"یہ حقیقت بالکل آ شکارا ہے کہ سائرس کی شخصیت اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔اس نے اپنی تمام معاصر قوموں کے دلوں پر اپنا حیرت انگیز تاثر نقش کر  دیا۔ اس کی ابتدائی نشو و  نما بالائی فارس کے  غیر آباد اور دور دراز گوشوں میں ہوئی۔ جس کی سرگذشت نے ایک افسانہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔اس کی ابتدائی تربیت کی روایتیں اس سے ڈیڑھ سو برس بعد زینوفن نے مدون و مرتب  کیں جو سقراط کا شاگرد تھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام روایتوں میں اس کا فضائلِ انسانیت کا جوہر عام طور پر نمایاں ہے،  خواہ ہم ان روایتوں کو اہمیت دیں ،  یا  نہ دیں۔ تاہم یہ حقیقت ہر حال میں غیر متزلزل رہتی ہے کہ اس کی تدبیر وسیاست کا دامن اس کی انسانیت وفضیلت کے جوہر سے بندھا ہوا تھا۔ اور جب یہ خصوصیت آشوری و بابلی شہنشاہوں کی بدعملیوں کے مقابلے میں لائی جاتی ہے، تو اس کی شریفانہ نمود اور زیادہ درخشندہ ہو جاتی ہے ۔"

پھر آگے چل کر پروفیسر گرنڈی  لکھتے ہیں:۔

"یہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز کامیابی تھی۔ بارہ برس پہلے وہ ایک چھوٹی سی ریاست "انشان" کا ایک گمنام رئیس تھا۔ اور اب ایشیاء کی وہ تمام مملکتیں اس کے زیر فرمان تھیں جہاں پچھلی قوموں کی بڑی بڑی عظمتیں ظہور میں آ   چکی تھیں۔ان تمام بادشاہتوں میں، جنہوں نے زمین کے مالک ہونے کے دعوے کئے،  ایک بادشاہت بھی ایسی نہ تھی جو اب اپنی ہستی کا کوئی موثر ظہور رکھتی ہو۔"

آکادی مملکت (Acadian Empire) کے نیم اصنامی سارگون سے لے کر نبو کد نزار (بخت نصر) تک سب کی مملکتیں اس کے آگے سربہ سجود ہو گئی تھیں۔ وہ صرف ایک بڑا فاتح ہی نہیں تھا بلکہ  وہ ایک بڑا حکمران  بھی تھا۔ قوموں نے یہ نیا  دور صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کا استقبال کیا۔ ان دس برسوں میں جو فتح بابل کے بعد گذرے۔ اس کی تمام وسیع مملکت میں ایک بغاوت کا واقعہ بھی نظر نہیں آتا۔

بلا شبہ اس کی رعایا پر اس کی طاقت کارعب چھایا ہوا تھا۔ لیکن وہ کوئی وجہ نہیں رکھتی تھی کہ اس کی سخت گیری سے ہراساں ہو۔ اس کی حکومت قتل وسلب کی سزاؤں سے بالکل نا آشنا رہی۔ اب تازیانوں  سے  مجرموں کو نہیں پیٹا جا تا تھا اب قتل عام کے احکام صادر نہیں ہوتے تھے۔ اب قوموں اور قبیلوں کو جلاوطن نہیں کیا جا تا تھا۔

بر خلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے آشوری اور بابلی بادشاہوں کے تمام مظالم کے اثرات بہ  یک جُنبشِ  قلم محو کر دیئے۔ جلاوطن قومیں اپنے اوطان میں لوٹائی گئیں۔ ان کے معبد اور معبود انہیں واپس دے دیئے گئے۔ قدیم رسموں اور عبادتوں کے خلاف کوئی جبر و تشدد باقی نہیں رہا۔ ہر قوم کے ساتھ پوری مذہبی آزادی دی گئی۔ دنیا کی گذشتہ عالم گیر دہشت ناکی کی جگہ ایک عالم گیر رواداری اور عفو و بخشش کا مبارک دور شروع ہو گیا۔ غور کیجیے کہ  قرآن نے چند لفظوں کے اندر جو اشارات کر دیئے ہیں۔ آج تاریخ کا داستان سرا کس طرح اس کے ایک ایک حرف کی شرح و تفصیل سنارہا ہے۔

اب چند لمحوں کے لیے ان تصریحات پر غور کیجیے  جو تورات کے صحائف میں درج ہیں۔ کس طرح وہ سائرس کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت واضح کر رہے ہیں۔ اور کس طرح قرآن کے اشارات بھی ٹھیک ٹھیک ان کی تصدیق ہیں۔

یسعیاہ نبی علیہ السلام  کی کتاب میں ہے کہ "خداوند کہتا ہے کہ :خورس میرا چرواہا ہے۔" اور پھر یہ بھی کہا ہے کہ " وہ میرا مسیح ہے۔" اور یرمیاہ نبی علیہ السلام کا بیان اوپر گزر چکا ہے کہ وہ بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے گا۔ اب دیکھیے کہ کیا  اس کی شخصیت ٹھیک ٹھیک ایک موعود اور منتظر نجات دہندہ کی شخصیت تھی یا نہ تھی؟

جب ہم اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پھر سائرس کے حالات  پر نظر ڈالتے ہیں تو بہ اول نظر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اس کا ظہور ٹھیک ٹھیک ایک ایسی شخصیت کا ظہور تھا، جس کے لیے وقت کی تمام قومیں چشم براہ ہوں۔ قوموں کا انتظار ان کی زبانوں پر نہیں ہو تا۔ ان کے حالات کے قدرتی تقاضے میں ہوتا ہے۔

غور فرمائیے ۔

اس عہد کی رفتار زمانہ کا قدرتی تقاضا کیا تھا؟ یہ تاریخ کے صبح تمدن کی وہ نمود تھی جس کی روشنی میں ہم انسانی حکمرانی کی ساری تاریکیاں پھیلی ہوئی دیکھتے ہیں۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ اس وقت تک انسانی فرمان روائی کی عظمت صرف قہر و غضب ہی کی نقاب میں رونما ہوئی تھی اور سب سے بڑا حکمران وہی سمجھا جا تا تھا جو سب سے زیادہ انسانوں کے لیے خوفناک ہو۔

آشور بنی پال نینوا کاسب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اس لئے کہ وہ شہروں کے جلانے اور آبادیوں کے ویران کرنے میں سب سے زیادہ بے باک تھا۔ بابل کی نشاۃ ثانیہ میں بخت نصر  سب سے  بڑا فاتح تھا۔ اس لئے کہ قوموں کی ہلاکت اور مملکتوں کی ویرانی میں سب سے زیادہ قہرمان تھا۔ مصریوں آکادیوں، ایلامیوں، آشوریوں اور بابلیوں سب میں انسانی حکومت و عظمت کے مظاہر خوف نا کی اور د ہشت انگیزی کے مظاہر تھے۔ اور ان کی شخصیتوں نے دیوتائی الوہیت کی تقدیس سے مل کر انسانوں کے قتل و تعذیب کا ہولناک استحقاق حاصل  کر لیا تھا۔ سائرس کے ظہور سے پچاس برس پہلے بنو کر نزار یعنی بخت نصر کی شہنشاہی کا ظہور ہوا۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیت المقدس پر پیہم تین حملے کر کے نہ صرف دنیا کاسب سے بڑا زرخیز علاقہ تاراج  و  ویران کر دیا بلکہ فلسطین کی پوری آبادی کواس طرح ہنکا کر بابل لے گیا کہ جوزیفس کے لفظوں میں "کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت وخوں خواری کے ساتھ بھیڑوں کو مذبح  خانے میں نہیں لے جاتا" ۔

پھر کیا ان حالات کا قدرتی تقاضا یہ نہ تھا کہ دنیا ایک نئی شخصیت کے لیے چشم براہ ہو ؟ قومیں ایک نجات دہندہ کی تلاش کر رہی ہوں؟ ایک ایسے نجات دہندہ کی جو انسانوں کے گلے  یا ریوڑ کے لئے خدا کا بھیجا ہوا "چرواہا"  ہو جو  ان کی بیڑیاں کاٹے اور ان کے سروں کا بوجھ ہلکا کر دے ۔

جو دنیا کو اس ربانی صداقت کا سبق دے دے کہ انسانی حکمرانی نوع انسانی کی خدمت کے لیے ہونی چاہیے۔ دہشت انگیزی اور خوف ناکی کے لیے نہیں۔

 دنیا بادشاہوں کے ہاتھوں سے تنگ آ چکی تھی۔ اب وہ ایک "چرواہے"  کے لیے مضطرب تھی اور یسعیاہ نبیؑ کے لفظوں میں خدا کا وہ فرستادہ چرواہا نمودار ہو گیا۔

 چنانچہ ہم دیکھتے ہیں زینوفن کے لفظوں میں کہ :" قوموں نے اسے قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کے استقبال کے لیے بے اختیار لپکیں۔ کیوں کہ وہ وقت کی جستجو کا قدرتی سراغ اور زمانہ کی طلب کا قدرتی جواب تھا۔ اور اگر رات کی تاریکی کے بعد صبح کی روشنی کا خیر مقدم کیا جا تا ہے ، تو ممکن نہ تھا کہ انسانی شقاوت کی اس طولانی تاریکی کے بعد صبح سعادت کی اس جہاں تابی کا استقبال نہ  کیا جاتا۔

(سارگون ، یا  عظیم سارگون ، آکادی سلطنت کا بانی تھا ، جس نے چوبیسویں  صدی قبل از مسیح میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔)

غور فرمائیےکہ   یسعیاہ نبی علیہ السلام   کے صحیفے کا یہ جملہ صورت حال کی کیسی ہو بہو تصویر ہے کہ" وہ میرا چرواہا ہو گا۔ وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا۔ میں اس کا داہنا ہاتھ پکڑ کر قوموں کو اس کے قابو میں دے دوں گا۔ اور بادشاہوں کی کمریں اس کے آگے کھلوا ڈالوں گا۔ میں اس کے آگے چلوں گا۔ ٹیڑھے راستے اس کے لیے سیدھے کر دوں گا۔"

سارے مورخ گواہی دے رہے ہیں کہ وہ یعنی سائرس  ایک چرواہے کی طرح آیا۔ اور اس نے بندگان خدا کی رکھوالی کی۔ سب کہہ رہے ہیں کہ اس نے جس ملک کا رخ کیا اس کی شقاوت ختم ہو گئی۔ وہ جس قوم کی طرف بڑھا اس کی بیڑیاں کٹ گئیں۔ اس نے جس گروہ کے سر پر ہاتھ رکھا اس کے سارے بوجھ ہلکے ہو گئے۔ وہ صرف نبی اسرائیل ہی کا نہیں بلکہ اس عہد کی تمام قوموں کا نجات دہندہ تھا۔

یاد رہے کہ یسعیاہ نبیؑ  کی اس پیشین گوئی میں اسے خدا کا مسیح بھی کہا گیا ہے۔ اور تورات کی اصطلاح میں مسیح وہ ہو تا ہے جسے خدا  اپنی بر کتوں کے ظہور کے لیے برگزیدہ کرلے اور خدا کے براہ راست ممسوح ہونے کی وجہ سے مقدس ہو۔ چنانچہ حضرت داؤد ؑکی نسبت بھی آیا ہے کہ وہ  مسیح تھے۔ سائرس کی نسبت بھی یہی کہا ہے اور اسی طرح بنی اسرائیل کی نجات کے لیے ایک آخری مسیح کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ سائرس کو مسیح کہنا بلاشبہ اس کے تقدس اور بارگاہِ الٰہی میں  بر گزیدگی کی سب سے زیادہ واضح  اور قطعی اسرائیلی شہادت ہے ۔اس سلسلے میں آخری وصف جو ذوالقرنین کا سامنے آتا ہے وہ اس کا ایمان باللہ ہے۔ قرآن کی آیتیں اس بارے میں ظاہر و قطعی ہیں۔ وہ ایک خدا پرست انسان تھا۔ آخرت پر یقین رکھتا تھا۔ احکام الٰہی کے مطابق عمل کر تا تھا۔ اور اپنی تمام کامرانیوں کو اللہ کا فضل و کرم سمجھتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہو تا ہے کہ کیا سائرس کا بھی ایسا ہی اعتقاد و عمل تھا۔ لیکن تمام پچھلی تفصیلات پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں تھا؟

یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت موجود ہے کہ خدا نے اسے اپنا فرستادہ اور  مسیح کہا اور وہ نبیوں کا موعود و منتظر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہستی خدا کی نا فرمان ہستی نہیں ہو سکتی۔ جس کا داہنا ہا تھ خدا نے پکڑا ہو اور جس کی ٹیڑھی راہیں وہ درست کر تا جائے، یقیناً وہ خدا کا نا پسندیدہ بندہ نہیں ہو سکتا۔ خدا صرف انہی کا ہاتھ پکڑ تا ہے۔ جو بر گزیدہ اور مقدس ہوتے ہیں اور صرف انہی کو اپنا فرستادہ کہتا ہے جو اس کے چنے ہوئے اور اس کی  درست ٹھہرائی ہوئی راہوں پر چلنے والے ہوتے ہیں۔

آج کل کے اصحاب نقد و نظر یسعیاہ نبیؑ کی اس پیشین گوئی کو مشتبہ سمجھتے ہیں کیوں کہ یہ سائرس سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی گئی تھی۔ لیکن اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے جب بھی صورت حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیوں کہ خود سائرس کے عہد میں جواسرائیلی نبی موجود تھے ان کی شہادتیں موجود ہیں۔ اور وہ صاف کہہ رہی ہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد یہی تھا۔ اور اسی حیثیت سے اس کا استقبال کیا تھا۔ حزقیلؑ اور دانیال ؑ، سائرس کے معاصر تھے۔ اور دارا کے عہد تک زندہ رہے۔ ان دونوں کی تصریحات سائرس کی نسبت موجود ہیں، پھر دارا کے زمانہ میں حجیؑ(Haggai) اور ذکریا ؑکے صحیفے مرتب ہوئے اور زر کسیس (اردشیر یا ارتخششت ) کے عہد میں عزیرؑ (Ezra) اور نحمیاہ  (Nehemiah) کا ظہور ہوا۔ ان کی سب کی شہادتیں بھی موجود ہیں اور ان سب سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائرس نبی اسرائیل کی ایک موعود ہستی تھی۔ اور خدا نے اسے بر گزیدگی کے لیے چن لیا۔ اگر یہودیوں کا عام اعتقاد یہ تھا تو کیا ایک لمحے کے لیے یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک بت پرست  انسان کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنے کی جرات کرتے؟ فرض فرمائیے یہ تمام پیشین گوئیاں سائرس کے ظہور کے بعد بنائی گئیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی نے بنائیں ۔ اور یہودیوں ہی میں پھیلیں۔ حتی کہ ان کی مقدس کتاب میں داخل ہو گئیں۔ پھر کیا ممکن تھا کہ بت پرست انسان کے لیے ایسی پیش گوئیاں بنائی جا سکتیں؟ کیا ممکن تھا کہ بت پرست کو اسرائیلی وحی کا ممدوح اور اسرائیلی نبیوں کا موعود بنادیا جاتا ؟

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے  کہ اجنبیوں اور غیر  اسرائیلیوں کے خلاف یہودیوں کا تعصب بہت ہی سخت تھا۔ ان کے نسلی غرور پر اس سے زیادہ اور کوئی بات شاق نہیں گزرتی تھی کہ کسی غیر اسرائیلی انسان کی بزرگی کا اعتراف کر یں۔ ظہور اسلام کے وقت بھی یہی بات  انہیں اعتراف حق سے روکتی تھی کہ

"ولا تو منوا  الّا لمن تبع دينكم۔ (۷۳:۳)

اور کسی پر ایمان نہ لاؤ ، مگر اس پر جو تمہارے دین کی پیروی کرے۔"

تاہم وہ سائرس کی فضیلت کے آگے جھک گئے جو  ان کے لیے ہر اعتبار سے اجنبی تھا۔ اور نہ صرف اس کی بزرگی ہی کا اعتراف کیا  بلکہ اس کو  نبیوں کا موعود اور خدا کا برگزیدہ تسلیم کر لیا۔ یہ صورت حال اس   بات کا قطعی ثبوت ہے کہ سائرس کی شخصیت ان کے لیے بڑی ہی محبوب شخصیت تھی۔ اور اس کی فضیلتیں ایسی قطعی اور آشکارا تھیں کہ ان کے اعتراف میں نسلی عصبیت کا جذبہ بھی حائل نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ ایک بت پرست انسان کے لیے جو اجنبی بھی ہو ، یہودیوں میں ایسی محبوبیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اگر ایک بت پرست بادشاہ نے انہیں ظالم حکمران کے ظلم سے نجات دلائی تھی تو وہ اس کی شاہانہ عظمتوں کی مداحی کرتے، مگر خدا کا مسیح اور برگزیدہ کبھی نہ سمجھتے۔ ضروری ہے کہ اس کی فضیلتیں مذہبی ہوں ۔ ضروری ہے کہ مذہبی حیثیت سے بھی عقائد  پر ان کا اتفاق  موجود ہو۔ یہ یہودیوں کی پوری تاریخ میں غیر اسرائیلی فضیلت کے اعتراف کا تنہا واقعہ ہے۔ اور ممکن نہیں کہ  یہ اتفاق ایک ایسے انسان کے لیے ہوا  ہو ،جسے وہ مذہبی حیثیت سے محترم نہ سمجھتے ہوں۔ لیکن   سوال یہ پیدا ہو تا ہے کہ سائرس کے دینی عقائد کے بارے میں ہماری معلومات کیا ہیں ؟ تاریخی حیثیت سے یہ امر  قطعی ہے کہ سائرس زردشت کا پیرو تھا،  جسے یونانیوں نے  "زار دست رو" کے نام سے پکارا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ  غالباً اس سائرس  ہی کی شخصیت ہے جو اس نئی دعوت کی تبلیغ و عروج کا ذریعہ ہوئی۔ اس نے فارس اور میڈیا میں نئی شہنشاہی کی بنیاد ہی نہیں رکھی تھی بلکہ قدیم مجوسی دین کی جگہ نئے زردشتی دین کی بھی تخم ریزی کی تھی۔ وہ ایران کی نئی شہنشاہی اور نئے دین دونوں کا بانی تھا۔

زردست  (یا زرتشت)کی ہستی کی طرح اس کے ظہور کا زمانہ اور محل بھی تاریخ کا ایک مختلف فیہ موضوع بن گیا ہے۔ اور انیسویں صدی کا پورا زمانہ مختلف نظریوں اور قیاسوں کی رد و کد میں بسر ہو چکا ہے۔ بعضوں کو اس کی تاریخی ہستی ہی سے انکار ہوا۔ بعضوں نے شاہنامہ کی روایت کو ترجیح اور گشتاسپ  (جسے یونانیوں نے Hystaspes کا نام دیا) والا  قصہ درست تسلیم کر لیا، بعضوں نے اس کا زمانہ ایک ہزار برس قبل مسیح قرار دیا۔ بعضوں نے یہ مدت دو ہزار برس قبل مسیح تک بڑھادی۔ اسی طرح  اس کے محل کے  تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعضوں نے باختر ،  بعضوں نے خراساں ، بعضوں نے میڈیا اور شمالی ایران قرار دیا۔ لیکن اب بیسویں صدی کی ابتدا سے اکثر محققین اور تاریخ دان  اس  رائے پر متفق ہوگئے ہیں اور عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ زردشت کازمانہ وہی تھا جو سائرس کا تھا۔ اور گشتاسپ  والی روایت اگر صحیح ہے تو اس سے مقصود وہی گشتاسپ ہے، جو دارا کا باپ اور ایک صوبہ کا گورنر تھا۔  زردشت کا ظہور شمال مغربی ایران یعنی آذربایجان میں ہوا جیسا کہ اوستا   (Avesta) کے حصہ  ویندی داد میں تفصیل سے واضح طور پر  بیان  کیا  گیاہے۔

البتہ کامیابی باختر میں ہوئی۔ جس کا گورنر گشتاسپ کا تھا۔

تحقیق کے مطابق زردشت کاسال وفات تقریبا ۵۵۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۸۳ قبل مسیح تک ہونا چاہیے۔ اور سائرس کی تخت نشینی بالا تفاق   پانچ سو پچاس قبل مسیح میں ہوئی، یعنی زردشت کی وفات کے تیس سال بعد یا عین اسی سال۔ لیکن اگر سائرس زردشت کا معاصر تھا  تو کیا کوئی براہ راست تاریخی شہادت موجود ہے۔ جس سے اس کا دین زردشتی قبول کرنا ثابت ہو؟ نہیں ہے ،لیکن اگر وہ تمام قرائن جمع کئے جائیں جو خود تاریخ کی روشنی نے مہیا کر دیے ہیں  تو یقیناً ایک بالواسطہ شہادت نمایاں ہو جاتی ہے  اور اس میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ سائرس نہ صرف دین زردشتی پر عامل تھا بلکہ اس کا پہلا حکمران داعی تھا۔ اور اس نے یہ ورثہ اپنے جانشینوں کے لیے چھوڑا جو دوسو برس تک بلا استثناء دین زردشتی پر عمل پیرا رہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ روشنی جن واقعات سے پڑتی ہے  وہ دو ہیں۔ اور دونوں کی تاریخی نوعیت مُسَلّم ہے۔ پہلا واقعہ گوماتہ  کی بغاوت کا ہے جو سائرس کی وفات کے آٹھ برس بعد ظہور میں آئی۔ دوسرا دارا   کے وہ کتبے ہیں ، جن سے اس کے دینی عقائد کی نوعیت آشکار ہو گئی ہے

سائرس کابالا تفاق  پانچ سو انتیس  قبل از مسیح میں انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کم بی سیز (کمبوچیہ یا کیقباد) تخت نشین ہوا۔ اس نے پانچ سو پچیس  قبل مسیح میں مصر فتح کیا۔ لیکن ابھی مصر میں ہی تھا کہ یہ  معلوم ہوا کہ   ایران میں بغاوت ہو گئی ہے۔ اور ایک شخص ، گوماتہ  نامی  نے اپنے آپ کو سائرس کا دوسرا لڑکا سمرڈیز (فارسی: برویہ) مشہور کر دیا ہے۔ جو بہت پہلے مر چکا تھا یامار ڈالا گیا تھا۔

یہ خبر سن کر وہ مصر سے لوٹا۔ لیکن ابھی شام میں تھا کہ  پانچ سو بائیس  قبل  از مسیح میں اچانک انتقال کر گیا۔ اب چوں کہ سائرس کی براہ راست نسل سے کوئی شہزادہ موجود نہ تھا۔ اس لئے اس کا عم زاد بھائی دارا، ا بن گشتاسپ تخت نشین ہو گیا۔ دارا نے بغاوت فرو کی۔ گوماتہ کو قتل کیا  اور نئی مملکت کواس کے عروج و کمال تک پہنچادیا۔ دارا کی تخت نشینی بالا تفاق  پانچ سو اکیس  قبل مسیح میں ہوئی تھی ۔ پس اس کا عہد سائرس کے انتقال سے آٹھ برس بعد شروع ہو گیا تھا۔ یونانی مورخوں کی شہادت موجود ہے کہ یہ بغاوت میڈیا کے قدیم مذہب کے پیروؤں کی بغاوت تھی اور خود دارا ،اپنے کتبۂ بے ستون میں گوماتہ  کو "مو گوش" لکھتا ہے یعنی مجوس۔ اور مجوسی مذہب سے مقصود قدیم مذہب ہے۔ موگوش کا لفظ ایک جگہ اوستا میں بھی آیا ہے اور اب یہ بات بالاتفاق  قطعی طور پر تسلیم کر  لی گئی ہے  کہ موگوش سے مقصود میڈیا کے اس مذہب کے پیرو ہیں جو زردشت کے ظہور سے پہلے وہاں رائج تھا۔ چوں کہ میڈیا  کے باشندے بابل اور شام میں موگوش کے نام سے مشہور ہو چکے تھے  اس لیے عربوں میں بھی یہی نام مشہور ہو گیا اور یوں موگوش نے مجوس کی شکل اختیار کر لی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ تمام ایرانیوں کو مجوسی ہی کہا جانے لگا۔ زردشتی اور غیر زردشتی کا امتیاز بالکل ختم ہی ہو کر  رہ گیا ۔ حال آں کہ اصلاً مجوسی ، زردشتی مذہب کے ماننے والوں کے دشمن تھے۔

تاریخ میں اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ پرانے مذہب کے پیروؤں کی سرکشی دارا کے ہاتھوں اس   گوماتہ کی سرکوبی کے بعد بھی جاری رہی۔ چنانچہ دوسری بغاوت "پر اؤرتیش"  نامی مجوسی نے کی تھی، جسے دارا نے ہمدان میں قتل کیا۔ اور تیسری "چترت خُمہ " نامی نے جوار بیل میں قتل ہوا۔

دوسرا واقعہ دارا کے کتبوں سے روشنی میں آیا ہے۔ یہ دنیا کی خوش قسمتی ہے  کہ دارا نے بعض بعض کتبے پہاڑوں کی محکم چٹانوں پر نقش  کرائے جنہیں سکندر کا حملہ بھی برباد نہ کر  سکا ۔ان میں سب سے اہم کتبہ  کوہ بے  ستون کا ہے۔ جس میں دارا نے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنی تخت نشینی کی سرگذشت قلم بند کی ہے۔ جب کہ  دوسرا  کتبہ استخر کا ہے۔ جس میں دارا نے  اپنے تمام ماتحت ممالک کے نام گنوائے ہیں۔ ان دونوں میں وہ بار بار "اہور موزدہ "کا نام لیتا ہے۔اور اپنی تمام کامرانیوں کو اس کے فضل وکرم سے منسوب کر تا ہے۔اور یہ ظاہر ہے کہ اہور موزدہ  کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور ہر خوبی ، کامیابی اور سر فرازی کا انتساب اسی کے نام کرتا ہے۔اور یہ بات واضح رہے  کہ "اہور موزدہ" ، زردشت کی تعلیمات کے مطابق ہمارے خدا ہی کا نام ہے۔

ان دوواقعوں پر ایک تیسرے واقعہ کا بھی اضافہ کر  دینا چاہیے۔ یعنی تاریخ میں کوئی اشارہ اس بات  کا نہیں ملتا کہ کم بی سیز نے کوئی نیا دین قبول کیا تھا۔ یا ، دار اکواس طرح کا کوئی معاملہ پیش آیا تھا۔ ہیر وڈوٹس نے دارا کی وفات کے پچاس ساٹھ برس بعد اپنی تاریخ لکھی ہے۔( دارا کی وفات بالا تفاق ۴۸۲ قبل مسیح میں ہوئی۔ اور ہیروڈوٹس ۴۸۴  قبل از مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ یعنی دارا کی وفات سے صرف دو سال بعد ۔) اس لئے دارا کے عہد کے واقعات ہیرو ڈوٹس کے لیے بالکل قریبی زمانے کے واقعات تھے۔ اور لیڈیا میں فارسی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے یونانیوں اور فارسیوں کے تعلقات بھی روز بروز بڑھ رہے تھے۔ تاہم وہ کسی ایسے واقعہ کا ذکر نہیں کر تا ۔

پس سائرس کی وفات اور دارا کی تخت نشینی کے درمیان آٹھ برس کی جو مدت گزری ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصے میں کسی نئی مذہبی دعوت کے ظہور و قبول کا کوئی واقعہ نہیں گزرا۔ اب غور فرمائیے۔ ان واقعات کالازمی نتیجہ کیا نکلتا ہے ؟ اگر سائرس کے بعد کم بی سیز اور دارا نے کوئی نئی دعوت قبول نہیں کی تھی اور دارا دینِ  زردشتی پر عامل تھا۔ تو کیا اس سے ثابت نہیں ہو رہا کہ دارا اور کم بی  سیز سے پہلے ہی  زردشتی دین ، اس خاندان میں آ چکا  تھا  ؟ اگر سائرس کی وفات کے چند سال بعد قدیم مذہب کے پیرو اس لئے بغاوت کرتے ہیں کہ کیوں ایک نیا مذہب قبول کر لیا گیا تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے   کہ سائرس نیا مذہب قبول کر چکا تھا۔ اور تبدیلی مذہب کا معاملہ نیا نیا پیش آیا تھا؟ پھر اگر زردشت سائرس کا معاصر تھا تو کیا یہ اس بات کامزید ثبوت نہیں ہے کہ سب پہلے سائرس ہی نے یہ دعوت قبول کی تھی اور وہ فارس اور میڈیا کا نیا شہنشاہ بھی تھا  اور نئی دعوت کا پہلا حکمران داعی بھی؟

زردشت اورسائرس

اتنا ہی نہیں ، بلکہ ہم غور کرتے ہیں ،تواس زنجیر کی کڑیاں اور آگے تک بڑھتی جاتی ہیں۔ البتہ ہم اسے ایک قیاس سے زیادہ کہنے کی جرات نہیں کریں گے۔ اگر سائرس زردشت کا معاصر تھا اور سائرس کا ابتدائی زمانہ خاندان سے الگ اور گم نامی میں بسر ہوا ،  تو کیا اس زمانہ میں دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کے قریب نہیں پہنچ جاتیں ؟ اور کیا ایسا نہیں سمجھا جا  سکتا کہ اسی زمانہ میں سائرس، زردشت کی تعلیم و صحبت سے بہرہ مند ہوا؟ سائرس کی ابتدائی زندگی کی سرگزشت تاریخ کی ایک گم شدہ داستان ہے۔ پھر کیا اس داستان کا سراغ ہمیں ان دونوں شخصیتوں کی معاصرت کے واقعہ میں نہیں مل جاتا؟

مورخ زینو فن نے سائرس کی ابتدائی زندگی کا افسانہ ہمیں سنایا ہے۔ اس افسانہ میں ایک پراسرار شخص کی پرچھائیاں واضح اور  صاف نظر آرہی  ہیں، جودشت وجبل کے اس پروردۂ قدرت کو آنے والے کارناموں کے لیے تیار کر رہا تھا۔ کیا اس پر چھائیں میں ہم خود زردشت کی مقدس شخصیت کی نمود نہیں دیکھ رہے؟ اگر زردشت کا ظہور شمال مغربی ایران میں ہوا تھا اور اگر سائرس کی ابتدائی گمنامی کازمانہ بھی شمالی کوہستان میں بسر ہوا، تو کیوں یہ دونوں کڑیاں باہم مل کر ایک گم شده داستان کا سراغ نہ بن جائیں؟

سائرس کی شخصیت وقت کے تمام ذہنی اور اخلاقی رجحانات کے بر  خلاف ایک انقلاب انگیز شخصیت تھی۔ ایسی شخصیت کسی انقلاب انگیز داعی کی دعوت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور صاف نظر آرہا ہے۔ کہ وہ داعی شخصیت زردشت ہی کی تھی۔

بہر حال، سائرس نے اپنی ابتدائی گمنامی کے عہد میں نئی دعوت قبول کی ہو، یا   تخت نشینی کے بعد ،لیکن یہ قطعی ہے کہ وہ دیِن زردشتی پر عامل تھا۔

دین زردشتی کی حقیقی تعلیم

لیکن اگر ذوالقرنین دین زردشتی پر عامل تھا۔ اور قرآن ذوالقرنین کے ایمان باللہ ااور ایمان بالآخرت کا اثبات کر تا ہے،  اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسے  اللہ کی جانب سے  الہام یافتہ بھی قرار دیتا ہے۔(سورۃ کہف : آیۃ 86)

 تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زردشت کی تعلیم دین حق کی تعلیم تھی؟ یقیناً لازم آتا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اس لزوم سے بچنے کی ہم کوشش کریں کیوں کہ یہ حقیقت اب اور پوری طرح روشنی میں آچکی ہےکہ زردشت کی تعلیم سر  تا سر خدا پرستی اور نیک عملی کی تعلیم تھی۔ اور آتش پرستی اور ثنویت(یعنی دو خداؤں) کا اعتقاد اس کا پیدا کیا ہوا اعتقاد نہیں ہے۔ بلکہ قدیم میڈیا کی  مجوسیت کا رد عمل ہے۔

 جس طرح روم کی مسیحیت، قدیم رومی بت پرستی کے رد عمل سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اسی طرح زردشت کی خالص خدا پرستانہ تعلیم بھی قدیم مجوسیت کے ردعمل سے بچ نہ سکی۔ خصوصاً ساسانی عہد میں جب وہ از سر نو مدون ہوئی تو اصل تعلیم سے بالکل ایک مختلف چیز بن چکی تھی۔

 زردشت کے ظہور سے پہلے فارس اور میڈیا کے باشندوں کے عقائد کی بھی نوعیت وہی تھی جو انڈو یور پین  آریاؤں کی تمام دوسری شاخوں کی رہ چکی ہے۔ ہندوستان کے آریاؤں کی طرح ایران کے آریاؤں میں بھی پہلے مظاہر قدرت کی پرستش شروع ہوئی۔  پھر سورج کی عظمت کا تصور پیدا ہوا ۔ پھر زمین میں آگ نے سورج کی قائم مقامی پیدا کر لی، کیوں کہ تمام مادی عناصر میں روشنی اور حرارت کا سر چشمہ وہی تھی۔ یونانیوں میں ایسے دیوتاؤں کا تصور پیدا ہوا جن سے اچھائی اور برائی دونوں ظہور میں آتی تھیں۔ لیکن ایرانیوں کے تصور نے دیوتاؤں کو دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیا۔

ایک قوت پاک ، جب کہ  دوسری قوت برائی کے عفریتوں کی تھی جو نوع انسانی کے جانی دشمن تھے۔ روحانی ہستیوں کی نمود روشنی میں ہوئی اور شیطانوں کی تاریکی میں ۔ نور و ظلمت کی یہی کشمکش ہے جس سے تمام اچھے برے حوادث ظہور میں آتے ہیں۔ چونکہ روشنی پاک روحانیتوں کی نمود ہے۔ اس لئے ہر طرح کی عبادتیں اور قربانیاں اس کے لیے ہونی چاہئیں۔ اس روشنی کا مظہر  آسمان میں سورج اور زمین میں آگ تھی۔ اچھائی اور  برائی کا جس قدر تصور تھا، وہ یونانیوں کی طرح صرف مادی زندگی کی راحتوں اور محرومیوں ہی میں محدود تھا۔ روحانی زندگی اور اس کی سعادت و شقاوت کا کوئی تصور پیدا نہیں ہو اتھا۔

آگ کی پرستش کی قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں۔ اور اس کے خاص پجاریوں کا ایک مقدس گر وہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے افراد  مو گوش کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آگے چل کر اس لقب نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کر لیا۔ لیکن زردشت نے ان تمام باطل عقائد  کا انکار کر دیا۔